**JIBAS** (The International Journal of Islamic Business, Administration and Social Sciences) (Quarterly) Trilingual (Arabic, English, Urdu)
ISSN: APPLIED FOR (P) & (E)
Home Page: http://jibas.org
Approved by HEC in Y Category
Indexing: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, Euro Pub.
PUBLISHER HABIBIA RESEARCH ACADEMY
Project of **JAMIA HABIBIA INTERNATIONAL,** Reg. No: KAR No. 2287 Societies Registration Act XXI of 1860 Govt. of Sindh, Pakistan.
Website: www.habibia.edu.pk,
This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

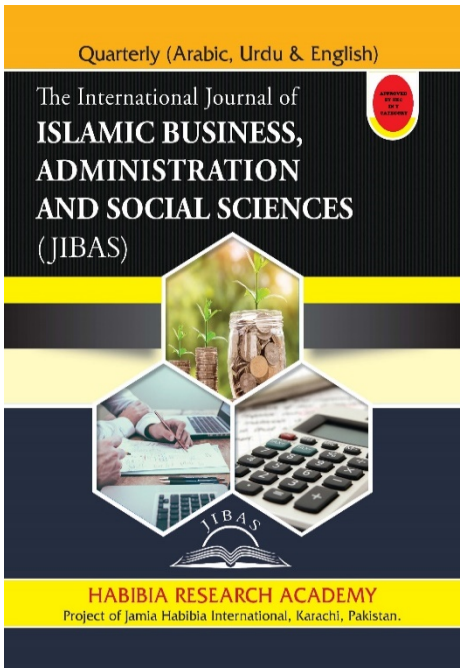


**TOPIC:**

# ROLE OF DEENI MADARIS IN NATIONAL SOLIDARITY

قومی یکجہتی میں دینی مدارس کا کردار

**AUTHORS:**

1. *Dr. Muhammad Iqbal Khan, PST Govt of Punjab Education Department, Multan, Pakistan, Email ID: iqbalmtn@yahoo.com*
2. *Prof. Dr. Hafiz Munir Ahmed Khan, Dean, Faculty of Islamic Studies, University of Sindh, Jamshoro. Email ID: hafizmunirahmedkhan@gmail.com*
3. *Dr. Mufti Imran-ul-Haq, Assistant Professor, Department of Quran & Sunnah, University of Karachi. Email ID: mihaq@uok.edu.pk*

***How to Cite:*** *Khan, Muhammad Iqbal, and Hafiz Munir Ahmed Khan. Imran-ul-Haq, 2024. "ROLE OF DEENI MADARIS IN NATIONAL SOLIDARITY: قومی یکجہتی میں دینی مدارس کا کردار". International Journal of Islamic Business, Administration and Social Sciences (JIBAS) 4 (2):1-24.*
*URL: https://jibas.org/index.php/jibas/article/view/135.*

Vol. 4, No.2 || April –June 2024 || P. 01-24
Published online: 2024-06-30

QR. Code

# ROLE OF DEENI MADARIS IN NATIONAL SOLIDARITY

## قومی یکجہتی میں دینی مدارس کا کردار

*Muhammad Iqbal Khan, Hafiz Munir Ahmed Khan, Imran-ul-Haq,*

***ABSTRACT:***

*This paper is about the Promotion of solidarity and Peace activities regarding the role of Deeni Madaris. The purpose of this paper is to highlight the importance of peace and Unity for the development of the nation. In this context, the role of Deeni Madaris in promoting religious and peaceful activities can be neglected. Therefore, the role of Deeni Madaris and its teachers & llamas has a key position in formulating a united nation or a divided nation into different groups or different schools of thought. The purpose of this article is to pinpoint the shortcomings of our Madaris, to present the important role of Madaris in eliminating sectarianism and increasing unity among the nation so that followers of different schools of thought in Islam and followers of other religions could survive a peaceful and happy life. This thing will promote not only the economy but the society will go towards development and real progress. In this way, everyone will perform his worship activities according to his faith and religion without cursing and abusing the other. In short, this paper presents some key points to maintain in an Islamic Society which is essential to remove our sectarian differences and Conflicts. For this, we all will have to adopt and stress upon Semitic guidelines rather than adopting the Sayings and quotations of Scholars and imams of Jurisprudence only.*

***Keywords*: *Solidarity, peace, Sectarianism, Respect, promotion of Brother Hood.***

**تعارف:**

تہذیب و ثقافت کسی بھی معاشرہ کے معیار زندگی اور ان کے رسم و رواج اور نقالی کے معیار کی عکاسی کرتی ہیں اس کے ساتھ ساتھ زبانوں کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ زبانیں ہی قوموں کا ہر قسم کے دور کو سامنا کرنے میں معاون کردار ادا کرتی ہیں۔ قوموں کے عروج و زوال میں اگر کچھ ان کے ساتھ رہتا ہے تو وہ ان کی زبانیں ہوتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اس کی واضح اور زندہ مثال اردو زبان ہے۔ اگر ہم اس زبان کے ارتقاء کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس صدیوں پرانی زبان کو مسلمانوں اور دیگر اقوام کے باہم میل جول سے ایک نیا روپ ملا اور یہ پورے برصغیر پاک و ہند میں عوامی رابطے اور افہام و تفہیم کا ایک اہم ذریعہ بن گئی، لیکن قریباً سوا سو سال پہلے ہندوؤں کے تعصبات اور تنگ نظری کے باعث برصغیر کی یہ عوامی اور ماحولی زبان صرف مسلمانوں کی زبان ٹھہرائی گئی ۔اس موقع پر مسلمانوں میں احیائے علوم کے قائد جناب سر سید احمد خاں نے واضح الفاظ میں کہا تھا"اب یہ دونوں قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں"۔[1] مذاہب کی تاریخ کے متعلق مولانا محمد سعید دہلوی اپنی تصنیف میں مذہب کو متضاد عناصر کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور نئے مذہب کا وجود پرانے مذہب کے بگاڑ کی وجہ سے جنم لیتا ہے۔ مذہب کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو آج ہم مذہب کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ بہت سے مختلف الاصل اور متضاد و عناصر سے مرکب ہے اور یہ عناصر ہمیشہ ساکن حالت میں نہیں رہتے بلکہ بعض دفعہ ایک دوسرے کے خلاف متحرک ہو کر مرکب میں ایک ہیجان اور اضطراب پیدا کر دیتے ہیں۔ منجملہ دیگر عناصر کے ہر ایک مذہب میں ایک عنصر ایسے خیالات کا بھی ہے جو کم از کم ظاہری صورت میں انقلابی تحریک سے مماثلت رکھتے ہیں اور بجائے خود یہ

بات کہ ہر ایک جدید مذہب کی تبلیغ بعض پرانے معتقدات اور رسومات کی تخریب اور جدید عقائد اور مراسم کی تعمیر پر مبنی ہوتی ہے۔[2] جہاں تک دین اسلام اور دین اسلام کے مدارس کا تعلق ہے تو یہ ہر دور میں نمایاں کردار سرانجام دیتے رہے ہیں۔ باہمی مذہبی و مسلکی اختلاف کے باوجود دین اسلام کی تبلیغ و تدریس اور ناموس رسالت کے تحفظ کے لئے یہ ہمیشہ یک جان ہو کر اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ہر دور میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ جہاں روشنی ہو وہاں اندھیرا ہوتا ہے۔ جہاں اچھائی ہو تو اس کے مقابلے میں برائی بھی ہوتی ہے ان دینی مدارس کے خلاف بھی عرصہ دراز سے سازشیں ہوتی چلی آئی ہیں کبھی میکالے قرارداد کی صورت میں علوم عربیہ واسلامیہ پر آفت آئی۔ جن کی تباہ کاریوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ یہ مدارس دینیہ ہی تھے جو علوم دینیہ اور فروغ علم کا قلعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کے بھی محافظ قرار پائے۔[3] اکیسویں صدی کے پہلے عشرہ سے خصوصاً عالمی طاقتوں کی اسلامی ممالک کے متعلق پالیسیاں تبدیل ہونے لگیں اور خصوصاً اسلامی ممالک کے دینی مدارس کو عالمی میڈیا کے ذریعے بنیاد پرستی کی نرسریاں قرار دیا جاتا رہا اور ان کے مالی وسائل کی جانچ پڑتال رجسٹریشن اور ان کے اساتذہ و طلباء کی معلومات کا ریکارڈ ایجنسیاں طلب کرتی رہی ہیں تاکہ پراپیگنڈہ کی حقیقت تک رسائی ہو سکے۔ عرصہ دراز سے اسلام دشمن قوتیں مدارس و جامعات کے خلاف مصروف عمل ہیں خصوصاً 16 دسمبر 2014ء) کے بعد مدارس دشمن عناصر اور غیر ملکی قوتوں کے آلہ کاروں کو مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ اور منفی تاثر قائم کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا۔ یہ عناصر جہاں حکومت پر اثر انداز نہ ہوئے وہاں ذرائع ابلاغ اور میڈیا کے ذریعے مدارس کے خلاف دن رات زہر افشانی میں مصروف ہو گئے۔[4]

**مسلک اور تقلید:**

یہ ایک حقیقیت ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے معاشروں میں رسم و رواج اور نقالی کا رجحان پایا جاتا ہے قطع نظر اس بات کے یہ معاشرے کے لئے مفید ہیں یا نقصان دہ ہیں لیکن ہر معاشرے کے رسم و رواج تقلید سے ہی رونما ہوتے ہیں جو بعد میں تہذیب و ثقافت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ کوئی معاشرہ طبقاتی تقسیم سے کلی بے نیاز نہیں، اشتراکی معاشرہ بھی بلند بانگ دعویٰ کے باوجود چند طبقات میں منقسم نظر آتا ہے۔ ہر معاشرہ کا ہر طبقہ کسی نہ کسی حد تک بد عملیوں اور بد عنوانیوں میں مبتلا ہی نظر آتا ہے۔ لیکن معاشرہ کی اصلاح یا ابتری کی ذمہ داری زیادہ تر بالا تر طبقہ پر ہی عائد ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کہ زیر دست طبقات اپنی بد اعمالیوں یا اصلاحی کوششوں سے بالا تر طبقات کو تو مطلق متاثر نہیں کر سکتے لیکن بالا دست طبقات اپنی بد اعمالیوں یا حسن عمل سے زیر دست طبقات کو فی الفور متاثر کیا کرتے ہیں۔ نیکی اور بدی کے متعدی اثرات اوپر سے نیچے کی طرف تو بآسانی پھیل جایا کرتے ہیں لیکن نیچے سے اوپر کی طرف پھیلنا ان کے لئے بے حد دشوار بلکہ اکثر ناممکن ہوا کرتا ہے۔ لہذا کسی معاشرے کی اصلاح کی ذمہ داری بھی زیادہ تر بالا دست طبقات پر ہی عائد ہوتی ہے۔[5] دنیا کے ہر مذہب میں اس کے ماننے والوں کے عقائد میں پایا جانے والا فرق ہی دراصل بنیادی تعلیمات کی وضاحت کی وجہ سے رونما پاتا ہے یعنی یہ صرف فروعی معاملات کو بنیادی تعلیمات پر ترجیح دینے کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن اس تعصب کی انتہا تب ہوتی ہے جب ہر مسلک یا فرقہ اپنے علاوہ تمام دوسروں کا غلط تصور کرنے لگتا ہے۔ ہر معاشرے میں اس بنیادی سماجی حقیقت سے انکار کرنے والے افراد موجود ہوتے ہیں تاکہ وہ نفرت اور تعصب کی آگ بھڑکا کر اپنے مفادات کی دکان چمکا سکیں۔ ایسے لوگ اپنے عقائد کو صحیح لیکن دوسرے کے عقیدے کو برا سمجھتے ہیں۔ اپنے عقیدے کی پیروی کرنے والوں کو نیک اور اپنے سے مختلف عقیدہ رکھنے والوں کو برے انسان سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کو یہ حق

دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ وہ اپنے ضمیر اور اپنی سمجھ کے مطابق عقیدہ اختیار کر کے اس پر عمل کر سکیں۔ یہ لوگ خود کو سچائی، علم، سمجھ داری اور دیانت داری کا آخری معیار سمجھتے ہیں اور زبردستی دوسروں سے اپنا عقیدہ تسلیم کرانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ رویہ بنیادی طور پر غیر جمہوری ہے۔ اس سے معاشرتی امن کی بجائے تشدد کو فروغ ملتا ہے۔ معاشرہ ترقی کرنے کے بجائے زوال کا شکار ہوتا ہے۔[6] دین مذہب اسلام میں بھی عیسائیت تقلید پرستی کی انتہا اور فروعی معاملات پر الجھاؤ نے مسلکی تعصب کو بڑھا دیا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ میں تنگ نظری کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے جو کہ مسلمانوں کو مسلکی فروغ کی دعوت دے رہا ہے جس میں حکومتوں کا کردار بھی شامل ہے۔ اس (ملائیت) نے اسلام کی ترقی پذیر روح کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اس وقت "مُلّا" ابدی صداقتوں کا حامل اور نگہبان ہونے کا دعویدار ہے۔ وہ ہر اہم مسئلے کا کسی قدیم مآخذ کی بنیاد پر ایک تیار حل رکھتا ہے۔ کوئی نیا مفکر و مصلح معتبر نہیں ہوتا کیوں کہ آزاد خیالی تمام تقلید پرستوں کے نزدیک مردود قرار دی گئی ہے۔[7] مولانا فیصل احمد ندوی "مجالس علی میاں" میں تقلید کے متعلق رہنمائی فرماتے ہیں کہ مختلف ادباء کو پڑھنا چاہئے تا کہ قاری کی سوچ محدود نہ ہو جائے۔ مختلف ادیبوں کی تحریروں کے مطالعہ سے ہی ان کا فرق اور معیار بھی قاری کو خود بخود معیاری تحریر کی طرف دعوت دے گا۔ مولانا نذر الحفیظ صاحب نے سوال کیا: کسی ایک ادیب کو پڑھ کر اس کی تقلید کی کوشش کرنی چاہئے یا مختلف ادباء کو پڑھنا چاہئے؟ فرمایا: جس کا ادب زیادہ پسند ہو اس کو زیادہ پڑھنا چاہئے لیکن اس پر اکتفا نہ کرے اور کسی کی تقلید نہیں چلتی، مختلف ادباء کو پڑھے گا تو اس کا خود ایک اسلوب بن جاتا ہے۔[8] پاکستان جو اس نظریہ پر قائم کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا تا کہ اسلامی اصولوں کے مطابق مسلمانوں کو ہر شعبہ میں رہنمائی میسر آ سکے۔ لیکن یہاں صورت حال یہ ہے کہ ہر دینی مدرسہ کو اس وقت رجسٹرڈ کیا جاتا ہے جب وہ اپنا خاص مسلک بھی درج کرتا ہے۔ یہ وجہ بھی مسلکی تعصب کو ہوا دے رہی ہے۔ عام طور پر دینی مدارس مسلک کی بنیاد پر قائم ہیں۔ کم و بیش ہر مدرسے میں اپنے مسلک سے متعلق کتب و رسائل ہی دستیاب ہیں۔ ان میں سے جن موضوعات کو پڑھایا جاتا ہے، انہیں بھی عموماً موجودہ دور کے مسائل کی روشنی میں نہیں پڑھایا جاتا اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ دین حق جو ایک جامع تصور حیات عطا کرتا ہے، کس طرح نوع انسانی کے مسائل کو حل کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ پوری تعلیمی زندگی کے بعد بھی نہ فرد کے کردار کی ان خطوط پر تعمیر ہوتی ہے اور نہ اس میں مطلوبہ فکری بالیدگی اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ سارا علم چند کتب اور مناظرانہ مباحث تک محدود ہو کر رہ گیا ہے ان کتب کی تدریس کے وقت بھی مثالیں اسی دور کی دی جاتی ہیں جن کا آج کے مسائل سے کچھ تعلق نہیں بنتا۔[9] ہر مسلک کے تحت چلنے والا مدرسہ بھی اپنے ہی مسلک کے اساتذہ کو تعینات کرتا ہے اور طلباء کو بھی اس مسلک کے متعلقہ کتب پڑھائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے مخصوص کتب کے مطالعہ سے طلباء بھی مستقبل میں اسی مسلک سے وابستگی رکھتے تھے بلکہ فروغ دینے میں بھی اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ عام طور پر مدارس کا اپنا الگ الگ فقہی مسلک ہوتا ہے۔ کتابیں بھی مسلک کی نمائندگی کرتی ہیں اور تدریس میں استاد بھی مسلک کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح طالب علم اس خاص مسلک کا اسیر بن جاتا ہے اور دوسرے مسالک کے متعلق تحقیر اور تردید کا ذہن پیدا کر لیتا ہے۔ اس سے تنگ نظری اور مناظرانہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ مختلف مسلکوں میں اتفاق اور اتحاد نہیں ہو پاتا تمام توجہ اختراق، اختلاف اور جزئیات پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ باہر جا کر ان اختلافات کو پھر وہ بھڑکاتے ہیں۔[10] ہمارے معاشرہ میں مسلک پرستی اور مسلکی تعصب کی بڑی وجہ محدود علمی مطالعہ اور تنگ نظری بھی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ مسلک کے اساتذہ

دیگر مسالک کی کتب کا مطالعہ اپنی فکر اور طلباء کے مطالعہ و مسلک کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں اور ہر دور میں حکومتی تعاون بھی اس مسلک کو حاصل ہوتا ہے جس مسلک کا حکمران ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں مخصوص مسلک کے حامل افراد کو نوازا جاتا ہے جس مسلک کا حامل حکومتی طبقہ ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں مسلک کو دین بنا دیا گیا ہے اور یہ کام ہمارے علماء نے خود کیا ہے۔ رسوخ فی العلم رکھنے والے سنجیدہ علماء میں اس مرض کی شدت کم ہے لیکن نچلے درجے کے واعظ اور مولوی جن کی نرسریاں مسلک پر مبنی ہمارے دینی مدارس ہیں، صرف اپنے مسلک کو حق پر سمجھتے ہیں اور دوسرے مسالک کو غیر حق اور باطل سمجھ کر ان کی مخالفت کرنا اور انہیں مٹانا احقاق حق کا تقاضا اور دینی خدمت سمجھتے ہیں اور انہیں سمجھانے اور ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں بلکہ بعض اوقات وہ اپنے بڑے علماء کی بھی نہیں سنتے اور حکومت کی بالواسطہ پشت پناہی بھی انہیں حاصل ہوتی ہے۔[11] شیعہ سنی اور دیگر مسالک کی باہمی کشمکش کے بجائے مسلک کو محض فروعی معاملہ سمجھتے ہوئے اجتہادی معاملات میں مخصوص فقہ کی پیروی ہی کو دین سمجھنا بھی تعصب کی وجوہات میں سے ہے۔ اس بارے میں ہمارا نقطہ نظر بھی بانیء پاکستان قائداعظم کی طرح ہونا چاہئے جسے وہ کسی مسلک کو نمایاں کرنے کی بجائے بطور مسلمان نمایاں ہوتے تھے۔ ہم نے مسالک کو دین بنالیا ہے۔ معاف کیجئے گا، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اپنا مسلک چھوڑ دیجئے، مسلک ہونا چاہئے، فقہ ہو یا کلام، ہر آدمی کا ایک مسلک ہوتا ہے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، لیکن وہ مسلک دین نہیں ہوتا، وہ اختیاری مسلک ہوتا ہے، اسکی حیثیت ایک رائے کی ہوتی ہے ۔ حضرت قائداعظمؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ شیعہ ہیں یا سنی؟ وہ وکیل آدمی تھے اور ہوشیار تھے، انہوں نے کہا نبی کریمؐ شیعہ تھے یا سنی؟ سوال کرنے والا خاموش ہو گیا کیوں کہ اس کے ذہن میں شرارت تھی۔ تو عرض یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مسلکی تقسیم ضرورت سے زیادہ شدید ہے اور بعض حلقوں میں خونی تقسیم بن گئی ہے۔ سینکڑوں آدمی قتل ہو چکے ہیں۔ اگرچہ اس کے اسباب زیادہ تر دوسرے ہیں۔ اصلاً مسلکی اور فقہی اختلافات بنیاد نہیں لیکن نور بشر کے جھگڑوں میں مسجدیں دھلتی ہم نے بھی دیکھی ہیں۔ حالانکہ اگر غور کریں تو ہمارے ملک میں مسلکی اختلاف کی کوئی بڑی بنیاد نہیں۔ اس لئے غالب اکثریت حنفی ہے۔ بریلوی بھی حنفی ہیں اور دیوبندی بھی، اہل ظاہر اور اہل حدیث بالکل تھوڑے ہیں، پانچ یا سات فی صد ہوں گے۔ تو پھر جھگڑے کیوں؟ اس وقت شیعہ کو چھوڑ کر باقی چاروں وفاقوں کے نصاب میں خاص فرق نہیں۔[12] پاکستان میں دینی جماعتوں نے بھی سیاست میں طبع آزمائی کرنا شروع کر دی ہے۔ لیکن ملکی سطح پر کسی بھی مسلک کی جماعت کو نمایاں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ بھی مسلکی پیروی ہے اور ہر سیاسی حلقہ میں مختلف دینی جماعتیں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے بھی ایک حلقہ ہی میں ووٹ تقسیم ہو جاتے ہیں اور ایک مسلک والا دوسرے مسلک کو ووٹ دینا گوارا نہیں کرتا جو مجموعی سطح پر ناکامی سے دوچار کر دیتی ہے۔ دینی سیاسی جماعتوں کی قومی سیاست میں ناکامی کی ایک وجہ ان کا فرقہ ورانہ تشخص اور ترجیحات بھی ہیں۔ ملک کی کوئی دینی سیاسی جماعت ایسی نہیں جو صرف ایک ہی مذہبی مکتب فکر کی نمائندگی نہ کرتی ہو۔ جماعت اسلامی نے اس دائرے سے نکل کر ہمہ گیر ہونے کا تصور دیا ہے لیکن طریق کار ایسا اختیار کیا کہ عملاً ملک میں پہلے سے موجود مذہبی مکاتب فکر میں ایک نئے نیم مکتب فکر کا عنوان بن گئی۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کی تشکیل مذہبی مکاتب فکر کی بنیاد پر ہے اور ان کے ہاں کارکنوں کی تربیت، قیادت کے چناؤ اور پالیسیوں کے تعین کا دارومدار بھی فرقہ ورانہ ترجیحات پر ہے۔ پھر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ہمارے دینی تعلیمی اداروں میں کارکنوں کی تربیت کے لئے دوسرے مذہبی مکاتب فکر کے خلاف ان کی ذہن سازی کا جو معیار قائم کر دیا گیا ہے لادین اور سیکولر لابیوں کے خلاف ان کی

ذہن سازی اس کا دسواں حصہ بھی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ دینی سیاسی جماعتوں کے کارکنوں سیکولر اور منافق سیاسی جماعتوں کے ساتھ مل بیٹھنا تو اس قدر معیوب نہیں سمجھتے لیکن آپس میں دوسرے مذہبی مکاتب فکر کے کارکنوں کے ساتھ مل کر بیٹھنے میں ان کا حجاب بدستور قائم رہتا ہے۔[13] ہر مسلک کے پیروکار اپنے مسلک کے ہی علماء و مفتی حضرات تک محدود تعلق رکھتے ہیں اور ہر مسلک کے اہل علم و اہل قلم حضرات نے بطور مسلمان کی بجائے بطور اس خاص مسلک کے اپنے آپ کو پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے جس کی وجہ سے فقہی اختلافات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ دینی مدارس میں ہمارے باہمی اعتقادی فقہی مباحث اور اختلافات پر خوب کام ہوتا ہے اور یہی ایک شعبہ ہے جس میں ہماری توانائیوں اور صلاحیتوں کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں لیکن اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات کا ہمارے ہاں کوئی تصور نہیں ہے۔ بسا اوقات ادنیٰ و غیر اولیٰ کے مسائل اور فروعی اختلافات کفر و اسلام کے معرکے کا روپ دھار لیتے ہیں اور کبھی اصولی اور بنیادی مسائل بھی نظر انداز ہونے لگ جاتے ہیں۔ اعتقادی مباعث اور فقہی اختلافات پر ضرور بات ہونی چاہیے اور طلبہ کو ان سے متعارف کرانا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ان اختلافات کی درجہ بندی اور ترجیحات بھی ان کے سامنے واضح ہونی چاہیے اور انہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ کون سی بات کفر و اسلام کی ہے اور کون سی بات اولیٰ و غیر اولیٰ کی ہے۔ کس اختلاف پر سخت رویہ اختیار کرنا ضروری ہے اور کون سے اختلاف کو کس مصلحت کی خاطر نظر انداز بھی کیا جاسکتا ہے۔[14]

**پاکستان میں تعصب کی بنیادیں:**

جہاں تک رنگ و نسل اور فرقہ بندی کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کا تعلق ہے تو دین اسلام بنیادی طور پر ہر قسم کی تفریق سے بالاتر ہے اور اللہ کے نزدیک صرف رتبہ اسی کا بلند ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ اسلام بنیادی طور پر نسل و رنگ کے تصور کے خلاف ہے۔ تنگ نظرانہ قومیت اور حب الوطنی، وسیع النظری اور انسانیت کے تصور کی راہ میں حائل ہے جس کو اسلام رد کرتا ہے۔ جغرافیائی اور نسلی گروہ بندی عارضی ہے۔ جو بات ایک حقیقی اسلامی ملت کی تشکیل کرتی ہے وہ جذبات اور نظریات کا ربط ہے۔ مقاصد اور کوششوں کی ہم آہنگی ہے۔ کسی عظیم مقصد کے حصول کے لئے تمام مسلمانوں کی مجموعی کوشش ہے اور ایک دوسرے سے ہمدردی، رنج و غم، خوشی و مسرت میں شرکت کرنا ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جو افراد کو یکجا کر کے حقیقی ملت بناتے ہیں اسلام ایسی ہی ملت کا نام ہے۔ یہ ملت جغرافیائی حادثات کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ خدائے واحد پر عقیدہ رکھنے سے تشکیل پاتی ہے اور ترقی کرتے کرتے ایک ایسی عالم گیر برادری کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی بنیاد باہمی محبت اور ہمدردی پر ہوتی ہے اس کے نتیجہ کے طور پر باہم برسرپیکار قوموں اور جماعتوں کا آپس کا اتفاق ختم ہو جاتا ہے اور تمام انسان ایک بین الاقوامی ملت کے افراد بن جاتے ہیں۔[15] جہاں تک پاکستان میں فرقہ بندی کے انسداد کا تعلق ہے تو یہ عملاً ناممکن ہے کیوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر مسلک کے دینی طلباء کے لئے امتحان لینے والے بھی علیحدہ علیحدہ بورڈ ہیں اور کوئی بھی نیا مدرسہ اس وقت تک رجسٹرڈ نہیں کیا جاتا جب تک اس کے مسلک کی نشاندہی نہ کی گئی ہو۔ فرقہ واریت کے فروغ کے لئے اسٹیبلشمنٹ نے کچھ پالیسیاں علی الاعلان اپنا رکھی ہیں مثلاً ملک میں کوئی مدرسہ اور مسجد نہیں بن سکتی جب تک وہ اپنا مسلک نہ لکھے۔ دینی تعلیم کے لئے ہر مسلک کے الگ الگ بورڈ (وفاق) کی منظوری دی گئی ہے تاکہ مسلک پرستی پروان چڑھے۔ مسلک کی بنیاد پر دینی سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت دی گئی ہے حالانکہ یہ خلاف آئین ہے۔ محکمہ اوقات میں خطیبوں اور اماموں کی تقرری مسلک کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ ان اعلانیہ

پالیسیوں کے علاوہ علماء کو باہم لڑانے اور دینی جماعتوں کو ایک دوسرے کے مقابل لانے کے لئے خفیہ ایجنسیاں ہر وقت حرکت میں رہتی ہیں۔ علماء کی ایک بڑی تعداد ان خفیہ ایجنسیوں کی تنخواہ دار ملازم ہے۔ ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک نے کئی دفعہ سٹیج پر کہا کہ جب وہ ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب تھے تو انھوں نے ایسی فہرستیں دیکھیں کہ بے شمار معزز علماء سی آئی ڈی کے باقاعدہ تنخواہ دار ملازم تھے۔[16] ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مطابق اختلاف رائے کی اسلام میں اجازت ہے لیکن اختلاف برائے اختلاف اور تنقید برائے تنقید قابل تعریف امور نہیں ہیں۔ جس سے اجتناب کرنا چاہئے کیوں کہ تنقید برائے تنقید نے مسالک کے باہمی اختلافات کو پروان چڑھایا ہے۔ فرقہ وارانہ اختلافات کا موجود ہونا ملک پاکستان کے صاحب اقتدار طبقہ کی مدارس کے لئے بنائی گئی پالیسیوں کی وجہ سے ہے کیونکہ کوئی بھی مدرسہ مسلک کو ظاہر کئے بغیر رجسٹرڈ نہیں کیا جاتا۔ اس طرح مسالک کو فروغ دینے میں رجسٹریشن کرنے والے ادارے بھی ذمہ دار ہیں۔ مدرسہ مسلک کی بنیاد پر پاکستان میں قائم ہوتا ہے یوں مسلک کے حوالے سے تعلیم اور مسلک کی شناخت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے جو تنازعات اور تصادم کا سبب بنتا رہا ہے۔ اب بھی فقہی مباحث میں اپنے روایتی مسلک کے برخلاف موقف کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں تاہم جامعات کے حوالے سے مذہبی اور مسلکی رواداری میں اضافہ ہو رہا ہے۔[17] ڈاکٹر سید عزیز الرحمن "مسلمانوں کا دینی و عصری نظام تعلیم" میں ڈاکٹر محمود احمد غازی کے "محاضرات تعلیم" میں درج خیالات کو منقول کر کے باہمی اختلاف کو باعث رحمت خیال کرتے ہیں۔ پاکستان میں فرقہ ورانہ اختلاف رائے اور مسلکی آراء اور نظریات کا تنوع شروع سے رہا ہے۔ مسلک کا وجود فی نفسہ مذموم نہیں کیوں کہ آزادی رائے کا لازمی نتیجہ ہے۔ آزادیرائے کا حق دنیا کے ہر مہذب نظام میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے اختلاف رائے کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اس کو ایک پسندیدہ چیز قرار دیا ہے۔ مسالک کا تنوع اور رائے کا صحت مندانہ اختلاف اسلام کی بہت بڑی خوبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں اہل علم کے اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔[18] جہاں تک پاکستان میں فرقہ بندی کا بڑھتا ہوا رجحان کا تعلق ہے یہ مسلسل بڑھ رہا ہے اس کی وجہ دینی مدارس کا نظام تعلیم اور سرکاری مدارس اور پرائیوٹ تعلیم اور سرکاری مدارس اور پرائیوٹ تعلیمی اداروں کا مختلف نظام تعلیم اور نظام تعلیم کا مختلف ذریعہ بھی ہیں۔ طبقاتی نظام تعلیم نے قوم کو متعدد حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ قومی بجٹ کا انتہائی قلیل حصہ ملکی آبادی کے انتہائی محدود طبقے پر غیر منصفانہ طور پر خرچ ہو رہا ہے۔ ناقص منصوبہ بندی سے وسائل کا ضیاع ہو رہا ہے۔ پورا تعلیمی نظام اول روز ہی سے دینی تعلیمات سے متصادم ہے۔ اس صورت میں نونہالان وطن کیوں کر قومی، ملکی اور ملی تقاضوں سے عہدہ براہ ہوں گے۔ نظام تعلیم کی زبوں حالی کی پستی اور بے چارگی کا یہ عالم ہے کہ دنیا بھر کی ایجنسیاں یہاں پاکستان میں جو نظام تعلیم چاہیں جاری کر لیں اور مروجہ نظام تعلیم میں جیسے چاہیں تبدیلی کر لیں، انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان ساری خرابیوں کی بنیادی جڑ یہ ہے کہ ہمارا نظام تعلیم، قومی، ملکی اور اسلامی مقاصد سے عاری ہے۔[19] ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق مذہبی تحریکیں دنیا کے ہر ممالک میں نئی نئی قائم ہو رہی ہیں اور قدیم تحریکوں کا فروغ ہونا فطری عمل ہے کیوں کہ عوام الناس مذہبی تحریکوں ہی میں ملک و قوم کی بہتری سمجھتے ہیں جس کی وجہ عوام کا سیاسی نمائندوں سے مایوس ہونا بھی ہے۔ موجودہ دور میں بنیاد پرست مذہبی تحریکوں کا زور بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ یہ تحریکیں دو وجوہات کی وجہ سے پیدا ہوئی اور اسلامی معاشرہ میں مقبول ہوئیں۔ ایک تو مغرب کا مسلمانوں کی جانب جارحانہ رویہ، کہ جس کی وجہ سے وہ خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے اور اپنے دفاع کے طور پر مذہب کا سہارا لیا۔ دوسرے خود اسلامی ملکوں میں سیکولر سیاسی حکومتوں نے عوام کے کوئی

مسائل حل نہیں کئے اور اپنی بدعنوانیوں اور غلطیوں سے لوگوں کو اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ اب ان بنیاد پرست تحریکوں میں اپنے مسائل کا حل دیکھنے لگے۔ اپنے حکمرانوں کی عیاشیوں اور لوٹ کھسوٹ سے اس قدر تنگ آئے کہ امام خمینی ان کا ہیرو بن گیا۔ یہ وہ واحد ذریعہ ہو گیا کہ جو معاشرہ کو پاک صاف کرے گا۔[20] ہمارے ملک میں انتہا پسندی و بنیاد پرستی کے فروغ کی وجہ عوام کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے حکومتی لاپرواہی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے معاشرہ کے افراد ابھی تک نصف کے قریب تعلیم سے محروم ہیں۔ تعلیم اور شعور سے محرومی بنیاد پرستی و تعصبات کو فروغ دیتی ہے۔ موجودہ شورش، فرقہ ورانہ تعصبات، انتہا پسندی، سیاسی تشدد اور جنونیت اس گناہ کی سزا ہیں جسے سادہ سے الفاظ میں جہالت کہتے ہیں۔ یہ وہ گناہ ہے جس کا ارتکاب ہمارے حکمرانوں نے بوجوہ اپنی عوام کے خلاف کیا۔ ہم نے غریب اور پسماندہ خاندانوں کو بچوں کو تعلیم دینے کی بجائے انہیں مدرسوں کے حوالے کر دیا، جن میں سے بعض میں نیم خواندہ ملاؤں نے ان کی ذہنیت کو ایک خاص نہج پر اس طرح ڈھال دیا ہے کہ اب تبدیلی ممکن دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ فوجی آپریشن کے باوجود ہماری سلامتی کو لاحق خطرہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خطرے کو فروغ دینے والا انفراسٹرکچر معاشرے میں بہت سی شکلوں میں پھیلا ہوا ہے۔[21] ہمارے ملک میں بین المسالک ہم آہنگی کی بجائے بین المذاہب ہم آہنگی پر تو زور دیا جاتا ہے اور مسالک کے مابین اختلافات کے بڑھنے کی وجہ سے مسالک کے درمیان رابطہ کی کمی باہمی رواداری کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کا گلہ کاٹ رہا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ وہ اس عمل کے باوجود اپنے آپ کو جنت کا مستحق بھی سمجھتا ہے۔ مذہبی لحاظ سے عدم رواداری کی دو مثالیں اور قسمیں ہیں۔ ایک تو دو مذاہب کے درمیان فرق اور علیحدگی سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری کسی مذہب کے مختلف فرقوں میں دوری اور ناپسندیدگی کی وجہ سے پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں تفریق، علیحدگی اور دوری کی وجہ "سچائی کا احساس ہوتا ہے۔ ہر مذہب کا بنیادی عقیدہ ہوتا ہے کہ سچائی صرف اس کے پاس ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگ گمراہ ہیں۔ ایک مرتبہ جب یہ فرق قائم ہو جاتا ہے تو پھر اپنا اور دوسروں کا علیحدہ سے ایک امیج بنتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے علاوہ دوسرے سب دشمن بن جاتے ہیں، پھر انہیں مارنا ختم کرنا، یا کمزور کرنا اپنی بقاء کے لئے لازمی قرار پاتا ہے۔[22] عصر حاضر میں برائی کے پھیلنے کی وجہ فسادی ٹولوں کا اتحاد ہے جب کہ دین جو کہ امن و رحمت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس دین کے عمل پیرا ہی باہم یک جان نہیں ہیں جس کی وجہ سے ہر قسم کے الزامات انہی کے ذمے لگائے جاتے ہیں اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ بنیاد پرست بھی یہی سمجھتے جاتے ہیں۔ آج بدقسمتی اور بدبختی سے خیر کی قوتیں (دینی جماعتیں) منتشر اور آپس میں دست و گریباں ہیں جب کہ شر کی تمام قوتیں تمام تر اختلافات کے باوجود مل کر ایک مضبوط طاقت بنی ہوئی ہیں اور خیر کو نیست و نابود کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ بڑی حد تک کامیاب بھی ہو چکی ہیں لیکن ہم دین کی خیر خواہی کے لئے کڑھنے والے اور دعوے کرنے والے اب تک بدقسمتی سے اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات بھی پس پشت ڈال کر اللہ اور اس کے رسول ؐ آخر کی رضا کی خاطر ایک اور متحد ہونے کو اپنی آن کا، اپنی ناک کا مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ نہ جانے ہماری آنکھیں کب کھلیں گی، آج ہم مسجد اقصیٰ بھول گئے، لگتا ہے کہ مسلمانوں کا اس سے کوئی کبھی تعلق ہی نہ تھا، بابری مسجد کی شہادت ہمارے اذہان سے محو ہو گئی، کل کہیں خدانخواستہ ہم یہ بھی نہ بھول جائیں کہ ہم اور ہمارے باپ دادا رسول ؐ عربی کے امتی اور نام لیوا تھے۔ اللہ قادر مطلق پوری امت کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔[23] ڈاکٹر محمد امین اپنی تصنیف "مسلم عروج و زوال میں تعلیم کا کردار" میں کسی بھی معاشرہ کے عروج و زوال کے اسباب کے متعلق حسب

ذیل انداز سے رقم طراز ہیں کہ مسلم زوال کی اس بنیادی توجیہہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم اس زوال کے دوسرے محرکات، عوامل اور مظاہر کی نفی کر رہے ہیں یا انہیں غلط سمجھتے ہیں جنہیں عموماً مسلم زوال کا سبب گردانا جاتا ہے جیسے کمزور سیاسی نظام، سیاسی عدم استحکام، تخلیق و تحقیق میں کمی، جمود، تقلید پر اصرار، سائنس و ٹیکنالوجی میں پسماندگی، فرقہ ورایت، معاشرتی ہم آہنگی کا فقدان، حربی استعداد میں کمی، اخلاقی کمزوری وغیرہ۔ یہ سارے اسباب بھی صحیح ہیں اور مسلمانوں کے زوال کی وجہ بھی ہیں لیکن ہم نے جس سبب کی نشان دہی کی ہے وہ سب سے بنیادی ہے، وہ سب اسباب کی جڑ ہے، آپ اسے ام الامراض بھی کہہ سکتے ہیں کہ ساری بیماریاں اس بنیادی خرابی اور مرض کی وجہ سے ہیں۔[24] مولانا محمد زکریا علمائے دین کی مخالفت کرنے والوں کو علمائے دین کی مخالفت سے باز رکھنے کے لئے تشبیہہ کرتے ہیں کہ وہ اس عمل سے باز آجائیں کیوں کہ اس طرح وہ اپنی دنیا اور آخرت دونوں خراب کر رہے ہیں کیوں کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جو لوگ علمائے حق کے درپے آزار ہیں ان کی اہانت و تذلیل کو فخر سمجھتے ہیں اور کرتے ہیں وہ غالباً بلکہ یقیناً علماء کی بہ نسبت اپنا نقصان زیادہ کر رہے ہیں۔ علماء کا تو زیادہ سے زیادہ یہ نقصان کریں گے کہ دنیاوی متاع میں شاید نقصان پہنچا سکیں، بشرط یہ کہ وہ مقدر میں کچھ کمی کر سکنے پر قادر ہوں۔ یا دنیوی عزت و جاہ کو (جو نہایت ہی بے وقعت اور ناپائیدار چیز ہے) نقصان پہنچا سکیں گے۔ مگر یہ لوگ اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں اور اپنا دینی نقصان کر رہے ہیں۔[25] پاکستان میں طبقاتی تعلیم کا پس منظر حقیقت میں ہندوستان کے مسلکی اور طبقاتی اداروں کے قیام سے وابستہ ہے جس نے ملکوں کے باہم تقسیم ہونے کے باوجود اپنے اثرات دونوں ملکوں پر دیرپا چھوڑے ہیں۔ نئی تعلیم کا ایک بڑا عیب اس کے سبب طبقاتی فرقہ بندی کا نشو و نما تھا۔ اسے حاصل کر کے ہر قوم خود کو جدید تصورِ قومیت کے مطابق "قوم" قرار دینے کے قابل ہو گئی۔ ایسی کوششیں بالارادہ کی جانے لگیں کہ ہر قومیت اپنے مخصوص تشخص کے لئے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرے اور ان کے توسط سے حاصل ہونے والی تعلیم ان کے مخصوص سماجی اور معاشی مفادات کا تحفظ کرے۔ چنانچہ شمالی ہندوستان میں کانستھ راجپوت، نائرا اور آہیر، اور جنوب مغرب میں مہر، نادار، لنگایت وغیرہ نے اپنے اپنے تعلیمی اور سماجی ادارے قائم کرنے شروع کئے۔[26] جہاں تک ملک پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کا تعلق تھا یہ بات تو نظریہ پاکستان کی بنیاد تھی لیکن مقتدر قوتوں نے قیام پاکستان سے لے کر اب تک اسلامی نظام کے نفاذ کو عمل کی بجائے نظریہ کی حد تک رکھنے پر ہی اکتفا کرنے کو غنیمت جانا۔ اسی وجہ سے ابھی تک ہم خود مختار اور خود انحصار نہیں ہو سکے۔ اسلامی شعائر سے تعصب کی وجہ سے وہ اس بات کو بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس ملک کی اسلامائزیشن صرف چند انتہا پسندوں کی آرزو نہیں ہے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں بلکہ یہ تو اس ملک کی ایک بڑی اکثریت کی تمنا ہے جس کے لئے ان میں سے لاکھوں لوگ اپنی جانیں پیش کرنے کے لئے تیار ہیں، بالکل اسی طرح جیسے انہوں نے تحریک پاکستان میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔[27] ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی اور روایت پسندی کو استعماری قوتوں کی مغرب زدگی کا اثر قرار دیتے ہیں جس کے لئے مقتدر قوتوں نے ہر حربہ آزمایا۔ جس کی وجہ سے بظاہر آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ذہنی طور پر آزاد نہ ہو سکے۔ مسلمانوں کے زوال پر گزرنے والی صدیوں نے اس کے اندر ناخواندگی، جہالت اور توہم پرستی کو پھیلانے میں مدد دی۔ ان خرابیوں کے باعث مسلمان دوام یا تو اندھے اعتقاد کا شکار ہیں یا الفاظ پرستی اور ظاہر قانون پرستی کی طرف مائل ہیں یا "شیخ" کی روحانیت کے معتقد ہیں۔ ان خرابیوں کے باعث وہ فکری حملوں کی زد میں رہتے ہیں۔ جب جدید دنیا ان سے ٹکرائی تو ان کی دفاعی سیاسی اور معاشی کمزوریوں نے ان کے اندر سراسیمگی پھیلا دی

۔ پھر انہوں نے جزوی اصطلاحات کرنا چاہی تا کہ عظمت رفتہ کی جلد از جلد بازیافت ہو جائے۔ غیر شعوری طور پر مغرب کی کامیابیوں سے متاثر ہو کر اور مغربی مشیروں یا اپنے مغرب زدہ مشیروں کے ورغلانے میں آکر انہوں نے مغرب زدگی کو اختیار کر لیا۔ جو ممالک استعماری قوتوں کے قبضے میں تھے ان میں تو حکمرانوں کے حکم پر مغرب زدگی کی ہر ممکن طریقہ سے اشاعت کی گئی اور اس کو فروغ دیا گیا۔[28] ڈاکٹر محمود احمد غازی "محاضرات تعلیم" میں نظام تعلیم کی یکسانیت کو ملت کی وحدت کے لئے لازمی امر قرار دیتے ہیں پس ان کے خیال کے مطابق:۔ تعلیم کی وحدت و نظام تعلیم کی یکسانیت اور یکجہتی، ملت اسلامیہ کی یکسانیت، یک جہتی اور یک رنگی کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔ ایسی صورت حال میں سے مسلمان دو مختلف طبقوں کا ایک سے زائد طبقوں میں تقسیم ہو جائیں، وہ طبقے تعلیم کے نام پر قائم کئے جائیں، وہ طبقے کسی آمدنی کے نام پر قائم کئے جائیں یا رنگ اور نسل کی بنیاد پر قائم کئے جائیں، ان تمام طبقوں کے بنیاد پر الگ الگ تعلیمی، دینی اور مذہبی اداروں کا وجود اسلام کے مزاج کے خلاف اور غیر اسلامی ہے۔ اس لئے میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ملک میں دینی تعلیم اور غیر دینی تعلیم کے جداگانہ اور بالکل الگ الگ ادارے جس انداز سے قائم ہیں، اس سے ملک و ملت کی وحدت اور یک جہتی متاثر ہو رہی ہے۔[29] جہاں تک پاکستان کے بارے میں عالمی رائے عامہ کا تعلق ہے تو مغرب والوں کے نزدیک اسلامی ممالک میں سے پاکستان کے ایٹمی پاور ہونے کی وجہ سے اس کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں ہے کیوں کہ دنیا کے کسی ملک میں بھی فساد اور خرابی کا ربط پاکستان سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اہل مغرب کی نظر میں پاکستان دنیا کا سب سے بڑا بنیاد پرست مسلمان ملک ہے اور پاکستان کی بنیاد پرستی کا سرچشمہ دینی مدارس ہیں، اس لئے دینی مدارس کو غیر موئثر بنانا اور عوام کے ساتھ ان کے اعتماد کے رشتہ کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر علماء کرام اور دینی مدارس کی کردار کشی اور انہیں منتشر رکھنے پر کروڑ ڈالر خرچ کئے جا رہے ہیں۔ ایمنسٹی انٹر نیشنل اس مہم کو لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہے اور پاکستان کے غیر معیاری اور برائے نام دینی مدارس کو بنیاد بنا کر ایک رپورٹ دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کر رہی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو آج کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے، انہیں مارا جاتا ہے، زنجیروں سے باندھا جاتا ہے، ان سے جبری بیگار لی جاتی ہے، ان کا خوراک، رہائش اور صفائی کا معیار ناقص ہے، انہیں ان مدارس سے آزادی رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں، انہیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جا رہا ہے تا کہ وہ قومی زندگی کے شعبے میں کھپ سکیں۔ ان کے نام پر چندہ جمع کر کے مدارس کے منتظمین کھا پی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی تنگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں[30]

**فرقہ وارانہ تعلیم کے سماجی اثرات:**

فرقہ ورانہ تعلیم پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے بھی برصغیر میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں بھی تھی اور انگلستان میں بھی عیسائیت کے پیروکاروں میں بھی تھی۔ لیکن اس وقت بھی بعض حضرات اس فرقہ ورانہ تقسیم اور فرقہ ورانہ تعلیم کو وحدت ملت کے منافی سمجھتے تھے اور اتحاد کے لئے کوششیں جاری رکھے ہوئے تھے۔ محمڈن اینگلو اورئینٹل کالج (ایم۔اے۔او۔کالج) میں مذہبی تعلیم کا مسئلہ پیچیدہ تھا۔ ذاتی طور پر سر سید احمد خان فرقہ وارانہ تعلیم کے خلاف تھے اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں اقتضائے وقت کے خلاف فرقہ ورانہ کالجوں کی موجودگی کے بھی خلاف تھے۔ جو مغرب میں قرون وسطیٰ کے ازکار رفتہ مسالک کی یادگار تھے۔ چناں چہ انہوں نے لازمی مذہبی تعلیم کا مسئلہ ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جس میں ان کے بعض شدید مخالف نقاد بھی شامل تھے اور اس طرح وہ اپنے اس مقصد

میں کامیاب ہو گئے کہ خواہ ان کی مذہبی انتہا پسندی کتنی ہی ناپسند کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کے عام اعلیٰ طبقوں سے کالج کی ہر دلعزیزی اور پسندیدگی پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے لیکن جدید طبعی علوم کے تجربات پر مبنی حقائق اور الہامی مذہب کے معلومہ حقائق کے درمیان جو خلا موجود تھا اس سے وہ بہت پریشان تھے۔ کیوں کہ یہ عمیق خلا ان نئی مسلمان نسلوں کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا جن کی وہ ماضی سے حال کی جانب راہ نمائی کر رہے تھے۔ ان کی نظری دینیات اور سارے طریق کار کا مقصد محرک یہی تھا کہ اس خلا کو کسی طرح پُر کیا جائے۔[31] جہاں تک عالم عرب اور پاکستان کی مساجد کے امام حضرات کا تعلق ہے تو عالم عرب میں مساجد کے امام دیگر سرکاری ملازمتوں کی طرح سرکاری ملازم ہوتے ہیں لہذا وہ مسلکی ہوا کو فروغ نہیں دے سکتے۔ جب کہ پاکستانی مساجد کے امام حضرات کسی حکومتی اہل کار کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے اور نہ ہی سرکاری تنخواہ کے ملنے کی امید ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے علماء کی روایت حریت اور آزادی فکر کی روایت ہے لہذا ابھی تک کوئی حکومت مسجدوں کو پوری طرح کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اب انتہا پسندی کے الزام کی آڑ میں بین الاقوامی لادینی قوتوں کے دباؤ سے ارباب اختیار بعض اقدامات کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں لیکن امید ہے کہ مسجد کی آزادی برقرار رہے گی۔ عالم عرب میں مسجدیں مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہیں وہاں خطیب سرکاری ملازم ہوتا ہے اور کسی سرکاری پالیسی پر لب کشائی نہیں کر سکتا۔ سرکاری انتظام میں مساجد کی ظاہری حالت بہت اچھی ہے۔ لیکن اس کے قائدانہ کردار اور رہنمائی کی حیثیت صفر ہے۔ پاکستان کی مساجد کا ایک اہم مسئلہ فرقہ ورانہ تقسیم ہے۔ ہر مسجد لازماً کسی فرقہ کی ہوتی ہے اور وہ فرقہ اپنی مسجد کو دوسرے فرقے کے خلاف مورچے کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ فرقہ ورانہ جدلیاتی مسائل اور نفرت انگیز تقاریر ان مساجد کے روحانی کردار کو مجروح کر رہی ہیں۔ اہل دین کی دل آزار تقریر، طعن آمیز خطبات اور سوقیانہ زبان نے لادینی عناصر کو جرأت دی کہ وہ مساجد کو بند کریں۔ خدا کرے کہ اہل دین ہوش مندی کا مظاہرہ کریں اور مساجد کی آزادی محفوظ رہے۔[32] موجودہ دور حکومت میں علماء حضرات اور دینی مدارس کے متعلقین بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کے الزامات بیرونی ممالک کی طرف سے اور بعض ملکی سیاسی اہل کاروں کی طرف سے بھی انتہا پرستی کے الزامات عائد کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے مالی وسائل کو منقطع کرنے کے لئے روز بروز مختلف پالیسیاں بنائی جا رہی ہیں۔ اپنی بنیادوں سے وابستہ رہنا یا بنیادوں کی طرف رجوع کرنا صرف مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ یہ تو ایک عالم گیر رویہ اور روایت ہے جس طرح یہودی اور عیسائی اپنے مذاہب کو اپنی زندگی میں زیادہ سے زیادہ دخیل اور موثر رکھتے ہیں اسی طرح بہت سے مسلمان بھی ایسا ہی کرتے ہیں لیکن مذہب کی بنیادوں کے ساتھ وابستگی کا مطلب متشددانہ رویہ اختیار کرنا نہیں ہے۔ کوئی بھی صحیح الدماغ شخص اسلام کے اندر بنیاد پرستی کا دیگر مذاہب کے متشددانہ فرقوں کی انتہا پسندی اور تشدد کے ساتھ موازنہ نہیں کر سکتا۔[33] فرقہ واریت اور مسلکی تعصب کے پیچھے جذباتیت کا عنصر بھی مسلکی تعصب کو بڑھاتا ہے اور باہمی مسلکی فرق مزید بڑھانے اور کشمکش کو تروتازہ رکھنے میں منفی شخصی رویوں کو بھی کردار نمایاں ہے۔ فرقہ واریت اور دیگر معاشرتی رویوں کے منفی ہونے میں بنیادی کردار تاریخی واقعات سے جذباتی وابستگی میں پوشیدہ ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے جیالے متوالے ہوں یا سول ملٹری کشمکش ہے، ان کے رویے کے منفی پن کی اصل جذباتیت کے گرد گھومتی ہے۔ راقم کی رائے میں یہ ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے کہ بالمشافہ ملاقات میں مذکورہ فریقوں میں سے کوئی تحمل اور برداشت کا مظاہر کرے۔ فکر و عمل کی ایسی متعصبانہ یک رخی میں دراڑ ڈالنے کے لئے چیٹ رومز سے فائدہ اٹھایا جا سکتا کہ باقاعدہ آمنے سامنے نہ ہونے

کے باعث دوسرے کی بات پر منفی قسم کی چیخ و پکار ممکن نہیں رہے گی اور سمجھنے کیلئے کثیر امکانات موجود رہیں گے۔[34] دنیا کی تاریخ میں ممالک کے مذہبی عقائد اور مذہبی جماعتوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ عنصر واضح ہوتا ہے کہ مسلکی جذباتیت نے ناسمجھ طلباء کے ذہنوں میں ایسے انداز سے برین واشنگ Brain Washing کی ہے جس کی وجہ سے وہ لوگ اپنے ہی ہم مسلک کو درست گردانتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام مسالک ان کی نظر میں غلط راستے پر ہیں۔ اسلامی بنیاد پرستی اور انتہا پرستی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ بیروزگار، غریب اور ناسمجھ نوجوانوں کو یہ اسلام کے ٹھیکیدار اپنے اسلامی جنونیت کے پردے میں اپنے مالی مفادات کے لئے ان کے ذہنوں میں انتہا پسندی کا زہر گھول کر استعمال کرتے ہیں۔[35] یہ بھی ایک تاریخی امر ہے کہ ہر مسلک کے پیروکاروں میں قدامت پسندی وجدت پسندی کے حامل افراد موجود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ہر مسلک کے اندر قدامت پسندی کو بھی فروغ دیا جاتا ہے اور جدت پسند طبقہ جدت پسندی کو فروغ دینا ضروری سمجھتا ہے۔ بنیاد پرستی کو جو طاقت حاصل ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول یہ کہ بنیاد پرست تجدید پسندی سے قبل کی اسلامی تحریکوں کے براہ راست جانشیں کے طور پر ایک ایسی روایت میں موجود ہے جو اسلام کے اندر سے اچانک نمودار ہوئی ہے اور اس کے لئے مقامی ہے، بنیاد پرستی جب بارہویں اور تیرھویں صدی ہجری (اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی) کے دوران مسلم دنیا میں ایک عمومی فینامنا کے طور پر سامنے آئی تو یہ ایک جدت دکھائی دیتی تھی جس کا قدامت پسندوں نے مقابلہ کیا۔ لیکن بیسویں صدی میں جب کہ معاشرے کو وسیع پیمانے پر مغرب زدگی کا سامنا ہے، یہ اچھی روایت بن گئی ہے اور اس کا تطہیری پروگرام ابھی تک اپنے اندر کشش رکھتا ہے۔ پھر قدامت پسند علماء کے مقابلے میں، یہ فعالیت پسند اور زوردار ہے اور اس لئے ترقی پسند بھی دکھائی دیتی ہے۔[36] تاہم مسلکی تعصب کی وجہ سے مسلمانوں کی بنیادی مآخذات قرآن وسنت سے دوری ہے جس کی وجہ سے فروعی معاملات پر زور دیا گیا ہے اور مساجد کے منبروں پر اختراعی معاملات میں بھی مسلکی رنگ تک محدود معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ اسلام میں بنیاد پرست تحریکوں کی رفتار اگر رک گئی ہے تو ہ ان کے دعوؤں کی وجہ سے نہیں ہوا۔ اس لئے کہ انہوں نے دعویٰ اجتہاد کا ہی کیا تھا، یعنی اسلام میں نئی سوچ کو رواج دینے کا۔ کوئی نئی سوچ کو بھلا کیسے روک سکتا ہے؟ خاص طور پر جب یہ باور کرایا جائے کہ اسلام کے فکری عمل کا سارا دارومدار ہی اجتہاد پر ہے۔ درحقیقت اسلام میں اس طرح کے فینامنا کو "بنیاد پرست" کہنا بھی اصطلاح کا غلط استعمال ہے، سوائے ان معنوں میں کہ وہ اصرار کرتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد دو اصل مآخذ یعنی قرآن اور سنت رسول پر ہے۔ ورنہ وہ اجتہاد اور تخلیقی فکر پر ہی زور دیتے ہیں جو ایک ایسی چیز ہے جس کو مغربی بنیاد پرست ممنوع قرار دیتے ہیں۔ وہ لوگ جہاں انجیل کے بنیاد اور اساس (Fundamental) ہونے پر زور دیتے ہیں۔ وہیں وہ کسی قسم کے بھی نئی یا اختراعی فکر کو رد کر دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے حالات کی ستم ظریفی ہے کہ مسلم بنیاد پرست کہلانے والوں کو مسلم جدیدیت پسندوں کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اس لئے کہ جہاں تک ان کے اعلان کردہ طریق کار کا تعلق ہے، مسلم جدیدیت پسند بھی بالکل وہی بات کہتے ہیں جو مسلم بنیاد پرست کہلانے والے کہتے ہیں۔ یہی کہ مسلمانوں کو اسلام کے اصل اور یقینی مآخذ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور انہی کی بنیاد پر اجتہاد کا کام سرانجام دینا چاہئے۔[37] بطور پاکستانی ہم نظریاتی مسلمان تو کہلاتے ہیں لیکن ہم عملاً اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے بلکہ ہمارے عمل بھی دکھاوا سے لبریز ہیں جس کہ وجہ رضائے الٰہی پس پشت ڈالنا بھی ہے۔ لہذا ہمیں قول کی بجائے عمل سے ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ہر شخص اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ خود کو راسخ العقیدہ مسلمان اور محب وطن پاکستانی ثابت کرے "ٹاک

شوز"میں اکثریت اس گفتگو سے آغاز کرتی ہے کہ میں خدا کے فضل سے پکا مسلمان ہوں، اور خدا کے علاوہ کسی اور سے نہیں ڈرتا ہوں۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ میں ایک محب وطن پاکستانی ہوں۔[38] ڈاکٹر امین کے مطابق ہمارے ہاں وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں شریعت اپیل بنچ بھی ہیں جو کہ اسلامی فقہ کے مطابق فیصلے کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ان کو بھی سیاسی مفادات کی نذر کر دیا جاتا ہے جو کہ درست عمل نہیں ہے۔ ایک اور اہم کام کا ذکر بھی ہم یہاں کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں شریعت اپیل بنچ موجود ہے۔ شرعی مسائل میں ان عدالتوں کو مسائل کی تحقیق کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ لیکن ہمارے دینی عناصر عموماً اس طرف توجہ نہیں دیتے پس اکا دکا لوگ اپنے مسلک کی حمایت کے لئے پہنچ جاتے ہیں اور ایسے ادارے موجود نہیں ہیں جو اس کام میں دلچسپی لیں۔[39] بعض لادین (سیکولر ذہنیت) قسم کے لوگ ہر معاشرے میں مذہب کی مخالفت کرتے ہوئے مذہب و دین سے پاک معاشرہ کو امن کی جگہ قرار دیتے ہیں کیوں کہ اس قسم کی ذہنیت کے حامل لوگ دنیا میں اور مختلف معاشروں میں باہمی فساد کا سبب مذہب کو سمجھتے ہیں جو کہ سراسر غلط فہمی ہے سادہ دلوں کا ایک گروہ باور کئے ہوئے ہے کہ سارے جھگڑے مذہبی اختلافات ہی سے پیدا ہوتے ہیں جن کے ختم کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی یا تو دنیا کو مذہب اور دین کے عنصر سے کلیۃً خالی کر دیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو سکے تو دنیا کو جنت بنانے کی ایک شکل احمقوں نے یہ تجویز کی ہے کہ زمیں کے ہر حصہ کو کسی خاص دینی فرقہ کا وطن بنا دیا جائے جب یہ ہو جائے گا تو شاید خود بھی یہی باور کئے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی باور کراتے پھرتے ہیں کہ آئے دن کے جھگڑوں رگڑوں سے ہمیشہ کے لئے فرصت ہو جائے گی۔[40] سلطان بشیر محمود کے مطابق معاشرتی زندگی میں مساجد کے کردار کو زیادہ فعال اور مفید بنانا ہو گا اس سے مذہبی لوگوں کی اہمیت بھی بڑھے گی اور لوگوں کو امام مسجد اور مسجد کمیٹی سے بھی رابطہ ان کے مسجد کے ساتھ دلی لگاؤ کو بڑھائے گا۔ کچھ لوگ مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں کہ علماء میں فرقہ بازی کی وجہ سے شاید تجویز کامیاب نہ ہو لیکن ان کی یہ مایوسی اس کے اسلامی پہلوؤں سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ اس میں سنت نبویؐ کا احیاء ہے اور کوئی بھی فرقہ سنت کے خلاف نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی کامیابی میں امام مسجد اور مسجد کمیٹیوں کی عزت ہے۔ لوگ بھی جب معاشرتی زندگی میں مساجد کے بڑھتے ہوئے فوائد کو دیکھیں گے تو اس کی حمایت کریں گے۔ اس لئے بھی یقین ہے کہ اگر یہ تجربہ چند ایک مساجد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو بات خود بخود آگے بڑھنے لگے گی۔[41]

**علوم قرآن فہمی اور نسل نوع:**

مولانا سمیع الحق "اسلام اور عصر حاضر" میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا ٹیچر ٹریننگ سنٹر میں داخلہ کے امیدواروں کے قرآن پاک کی قرأت کے متعلق اہلیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر چوہدری محمد علی صاحب کا یہ بیان پوری قوم کو چونکا دینے والا ہے کہ اس مرتبہ یونیورسٹی کے ٹیچر ٹریننگ سنٹر میں داخلہ لینے کے لئے جتنے مرد اور خاتون امیدوار آئے ان سب میں سے ایک کو بھی قرآن مجید پڑھنا نہیں آتا تھا۔ ان میں سے بعض نے اپنے والدین کو بھی قصوروار ٹھہرایا جنہوں نے انہیں اسلامی مبادیات اور قرآن مجید کی تعلیم سے کورا رکھا۔[42] یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان جب کلمہ حق کی سربلندی کے لئے کوشاں رہے تو دنیا بھی انکے سامنے سرنگوں رہی اور وہ انسانیت اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرتے رہے لیکن جب مسلمان دنیا طلبی میں کوشاں ہوئے تو دنیا کی لذتیں ان سے اتنی ہی دور ہو گئیں اور وہ دنیا میں ذلیل و خوار بھی ہوئے۔ ہمیں تعلیم دی گئی کتاب و سنت کی مگر ہم نے اپنی نسلوں کو ان دونوں سے دور

رکھا اور ترقی و کامیابی کا ضامن غیروں کی کافرانہ تعلیم گاہوں کو سمجھا۔ ہمیں ہمارے رسولؐ نے واضح ہدایات دیں کہ مسلمان کی نظروں میں دنیا اور ان کی چند روزہ عیش و عشرت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ وہ ایک اہم مقصد رضائے حق اور اعلاء کلمتہ اللہ کی خاطر موت کو اتنا محبوب سمجھتا ہے جتنا کہ کافر قوتیں شراب کو مسلمان دنیا کو اکبر "ھم" نہیں بناتا۔ وہ موت کو وصال محبوب کا ذریعہ اور راہ حق میں شہادت حیات جاودانی کا موجب سمجھتا ہے مگر ہم نے دنیا کی چند روزہ زندگی کو لذت کی شے ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ ہم دنیا اور مال و دولت کے غلام بن کر رہ گئے۔ ہمارے ریگستانوں پر پیرس اور لندن کے بازاروں کا شبہ ہونے لگا مگر ہماری مسجدیں ویران ہو گئیں اور وہی کچھ ثابت کر دکھایا جس کا مخبر صادق و مصدقؐ کو خدشہ تھا۔[43]

### 6۔ اسلامی تہذیب پر مغربی اثرات:

یہ ایک حقیقت ہے کہ ماضی کی نسبت اٹھارہویں صدی کے وسط کے بعد لادینی افکار و نظریات کے غلبہ کے بعد مادہ پرستی کی فضا قائم ہو گی جس کے اثرات سے مسلم ممالک بھی محفوظ نہ رہ سکے اس لئے مغربی ممالک کی تہذیبوں کے ساتھ ساتھ مسلم ممالک کی تہذیبوں کو بھی متاثر کیا جس کے اثرات مغربی کلچر اپنانا سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ مغربی اقوام نے گذشتہ دو صدیوں میں تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں۔ علم و ہنر کے نئے چشمے دریافت کئے اور پوری دنیا میں اپنی ترقی کے اثرات پھیلاتے چلے گئے۔ اس ترقی کے پیچھے مذہب سے مخالفت کا اہم سبب کار فرما تھا۔ کیوں کہ اہل کلیسا علمی ترقی کے مخالف تھے مذہب اور جدید بیداری میں ایک مقابلہ کی فضا قائم ہو گئی۔ یہ جدید علوم تنقیدی فلسفہ اور علوم طبعی پر مشتمل تھے۔ انسان نے ان علوم سے فلسفہ فطرت تو مسخر کر لیا مگر اس کے ایمان کی دولت چھن گئی۔ انہی لا دینی افکار و نظریات اور مادہ پرستانہ فلسفہ نے نہ صرف ان مغربی ممالک کی تہذیب کو تلپٹ کر دیا بلکہ مسلم معاشرے سے تہذیب و تمدن کی اس روح کو مسخ کر کے باہر نکال دیا گیا کہ جس پر ان کی بنیاد تھی۔ مسلم معاشرے پر کئی طرح کی مغربی، فکری، ثقافتی یلغار نے مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات، اسلامی نظام تعلیم، اسلامی سیاسی، معاشی و معاشرتی نظام کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ مسلم معاشرے اس یلغار کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور ان سامراجی طاقتوں کی طرف سے پھیلائی جانے والی تبدیلیوں کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے لگے چاہے وہ ان کے مذہب سے متصادم ہی کیوں نہ ہوں۔[44] اسی لئے اب لوگ مسلم ممالک میں بھی مغربی طرز انداز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں اور مادہ پرستی نے باہم رشتے داریوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس لئے اب دنیاوی ٹھاٹھ باٹھ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خدا طلبی کے بجائے اب یہ دنیا طلبی کا دور ہے اور اس سے کہیں زیادہ زور و شور کے ساتھ آیا ہے، اس مغربی تہذیب و اقتدار کے دور میں دنیا طلبی اور شکم پری وہ طوفان آیا ہے، اس کے لئے بحران و ہذیان سے کم الفاظ کفایت نہیں کرتے، مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی بھوک اور ایک نہ بجھنے والی پیاس ہے جس کو جوع البقر کہئے یا استسقا کا مرض ہر طرف "فھل من تزید" کی صدا بلند ہے، زندگی کی ہوس اتنی بڑھ گئی ہے اور معیار اتنا بلند ہو گیا ہے کہ مسافر طمع کو کسی منزل پر قرار اور طائر حرص کا کسی بام بلند پر بھی آشیانہ نہیں دولت اور عزت جاہ کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار اور اونچی سے اونچی تشفی کے لئے کافی نہیں۔[45] لہذا موجودہ صدی میں ہماری بقا صرف اسی میں ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد اور نیک اسلاف کے طرز عمل کو اپناتے ہوئے اپنی زندگیوں کو قرآن و سنت کے عملی اصولوں کے مطابق بنالیں کیوں کہ اسی میں ہماری دونوں جہانوں کی کامیابی کا راز ضمر ہے فکری حوالے سے اکیسویں صدی کے تناظر میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے فقہی اور گروہی اختلافات کو فراموش کر کے اسلامی افکار کا وہی

رویہ اختیار کریں جو خود شارع اسلام آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین نے اختیار فرمایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے دور میں پیش آمدہ مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں مصالح امت اور مصالح وقت کو مد نظر رکھ کر تلاش کیا جاتا تھا۔ فقہائے متقدمین نے بھی اسی انداز کو جاری رکھا لیکن ہم نے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے فقہائے متقدمین کے کام کو حتمی سند اور قطعی حکم کے مترادف قرار دے دیا۔ نتیجتاً اسلامی افکار پر ایسا جمود طاری ہوا جس سے فقہی اور گروہی اختلافات نے تو نشو نما پائی لیکن اسلامی افکار کے آئینے میں وہ تدابیر اختیار نہ کی جا سکی جو اسلام کا طرہ امتیاز تھیں۔ لہذا شاہ ولیؒ اللہ اور علامہ اقبالؒ نے خصوصاً تدابیر منزل اور اسلامی افکار کی تشکیل نو کی ضرورت پر زور دیا۔[46]

**فروعی اور مسلکی مسائل کا حل:**

مسلمانوں کو تعصب سے بچاؤ اور فرقہ بندی سے بچنے کے لئے عرصہ طویل کی منصوبہ بندی پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپس کے اختلافات کو بھی بھلانا ہو گا۔ یہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ خلافت قائم کرنا ان کا حق ہے اور وہ یہ ضرور قائم کریں لیکن مغرب کے رویے سے شغل ہونے کے بجائے وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیں۔ منصوبہ بندی اور حکمت عملی سے کام لیں۔ مغرب کی انتہا پسندی کا جواب انتہا پسندی سے نہ دیں۔[47] جہاں تک جدید دور اور قدیم دور کے مسلمانوں اور ان کی عبادت گاہوں کا تعلق ہے، قدیم دور میں مسلمان مسجدوں کے کچا ہونے کے باوجود پکے نمازی تھے لیکن موجودہ دور میں مسجدیں تو پکی ہیں لیکن نمازی کچے ہیں یعنی مسلمانوں کا اپنی عبادت گاہوں سے تعلق پختہ نہیں رہا جس کی وجہ سے باہمی اتحاد اور عبادات سے تعلق بھی کمزور ہو گیا۔ مسلم امہ کا وجود زمین پر مسجد سے لازم و ملزوم ہے جس کا آئیڈیل رسول اکرمؐ کے زمانے اور خلافت راشدہ کے دور میں مسجد نبویؐ تھی۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی اور روحانی طاقت کا سرچشمہ تھی اور یوں پوری امت کا دارالخلافہ تھی۔ اسی نمونہ پر صوبوں کے صدر مقام کی مسجدیں تھیں۔ یوں اپنی اپنی سطح پر ہر ایک مسجد خلافت کے نظام کی قائم مقام تھی لیکن دھیرے دھیرے مساجد کی یہ پہچان اور شان قصر صدارت میں منتقل ہو گئی مساجد کا نظام کمزور ہوتا گیا اور نتیجتاً اسلام کی قوت بھی کمزور ہوتی گئی۔ بالآخر دوسرے مذاہب کے پوجا پاٹ کے گھروں کی طرح ہماری مسجدیں بھی فرقہ بازی کی بنیاد پر محض عبادت خانے بن کر رہ گئیں اور اب زیادہ تر مسلمانوں کے اتحاد کے بجائے باہمی تفریق کی جگہیں ہیں۔ اگر ہم اسلام کی نشاۃ ثانیہ چاہتے ہیں تو مسلم معاشروں میں مساجد کو نبی پاکؐ کی مسجد کے نمونہ کو سامنے رکھ کر مرکزی کردار واپس لانا ہو گا۔[48] مولانا محمد زکریا موجودہ دور میں مسلکی اختلافات کو ختم کرنے اور تنقید برائے تنقید کو روکنے کے لئے ایک بہتر نسخہ تجویز کرتے ہیں کہ ہمیں کسی کے قول کو منسوخ یا رد کرنے کے لئے نصوص سے استدلال کرنا بہتر ہو گا۔ کسی عالم کے قول کو رد کرنے کا حق ضرور حاصل ہے، اس کی تردید ضرور کی جا سکتی ہے مگر جب اس کے قول کے بالمقابل تردید کا شرعی سامان موجود ہے۔ اس کے قول کے خلاف مخصوص شرعیہ موجود ہو اور رد کرنے والا مخصوص سے استدلال کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ میرا مقصود ہرگز نہیں ہے کہ عالم جو بھی کہہ دے وہ صحیح ہے اور اس کے قول پر ردو انکار نہ کیا جائے۔[49] ڈاکٹر محمد رفیع الدین "قرآن و علم جدید" میں مسلمانوں کو آپس کے اختلافات کی بجائے قرآن کے جدید دور کے تقاضوں اور جدید دور کے نظاموں تعلیمی و اقتصادی وغیرہ کو ڈھالنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ قرآن کی تعبیرات کے بارے میں ہمارا اختلاف جو در حقیقت ہمارے بڑے بڑے فضلاء اور علماء سے شروع ہوتا ہے۔ ہماری قومی ترقی کے راستہ میں ایک سنگ گراں کا حکم رکھتا ہے اس اختلاف کی وجہ سے ہم من حیث القوم واضح طور پر نہیں جانتے کہ آج زندگی کے مختلف شعبوں

میں اسلام ہم سے کس قسم کے عمل کا مطالبہ کرتا ہے مثلاً ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کا سیاسی یا اقتصادی یا تعلیمی یا قانونی یا تبلیغی نظام کیا ہونا چاہئے۔ دراصل جب ہمیں یہی معلوم نہ ہو کہ اسلام کیا ہے تو ہم کیوں کر طے کر سکتے ہیں کہ اسلام کیا چاہتا ہے۔[50] جدید نسل کا یہ المیہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کو تعلیمات سے اچھی طرح آگاہ نہیں جس کی وجہ سے وہ اسلام کے سنہری اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی بجائے غیر ملکی تہذیبوں کی پیروی کرنے لگے ہیں جو کہ درست روایات میں سے نہیں ہے۔ اسلامی ورثے اور مغربی فکر سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کا فرض ہے کہ وہ قرآن مجید اور رسول کریمؐ کی زندگی کا خود گیری نظر سے مطالعہ کریں، توہمات تعصبات اور غیر صحت مند روایات سے ہٹ کر، یہی ایک راہ ہے جس پر چل کر مسلمان اپنے آپ سے آگاہ ہو کر اکیسویں صدی میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔[51] ڈاکٹر اسمعیل راجی فاروقی "علوم جدید کی اسلامی تشکیل" میں مسلمانوں کو جدید دور سے ہم آہنگ کرنے اور جدید دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے درج ذیل انداز سے اسلامی اطوار و آداب سے آگاہی دیتے ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے ہر گوشے کو اسلامی رنگ میں رنگ دے یعنی زندگی کے ہر جزئیہ کی ایسی عملی تعبیر پیش کرے کہ اس کا تعلق اسلام سے قائم ہو جائے۔ زندگی کے بہت سے گوشوں کے متعلق قرآن نے خود بھی ایسا کیا ہے۔ ان گوشوں سے عام طور پر "نرم احکامات" آتے ہیں۔ یہ غیر جانب داری کا علاقہ سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً سلام کرنا، نرم لہجہ میں گفتگو کرنا، گھر میں داخل ہونے سے قبل دروازہ کھٹکھٹانا، دعوت سے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جلد رخصت ہو جانا، بزرگوں اور والدین کے ساتھ احترام کے ساتھ پیش آنا وغیرہ۔ رسولؐ اللہ نے اس انطباق کو تکمیل تک پہنچانے کی پوری کوشش کی۔ اپنی تعلیمات اور اپنے نمونہ کے ذریعے مثلاً کھانے پہننے کے آداب، طہارت و صفائی کے طریقے، تفریح و مزاج کے طریقے، ہمسایہ کے آداب وغیرہ۔ وہ طریق زندگی جو قرآن و سنت کے اصول کی روشنی میں قرن اول میں قائم ہوا تھا، آج ضرورت ہے کہ اس کو دوبارہ متعین کیا جائے، دوبارہ مشخص کیا جائے اور تکمیل کی جائے ان سرگرمیوں تک جو اس دور میں بھی نامعلوم تھیں اور ان سرگرمیوں کے متعلق اسلام کے احکام سختی سے نافذ کئے جائیں۔ جو سابق میں ضمنی یا تعیش کے دائرہ میں آتی تھیں اور آج ضرورت بن گئی ہے۔ مثال کے طور پر معاشرتی روابط سفر اور سامان نقل، سمعی بصری تفریح، ابلاغیات عوام وغیرہ، مسائل ہیں جن پر اسلامی حکام کی وضاحت کی ضرورت شدید ہے۔[52] ڈاکٹر یوسف القرضاوی، مسلمانوں کو باہمی اختلافات کو اجاگر کرنے کی بجائے اتفاق و اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں کیوں کہ باہمی انتشار سے نہ صرف آپس کی قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں بلکہ بیرونی عناصر کو بھی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ قوم کبھی اپنے دشمنوں پر غالب نہیں آسکتی ہے جو خود اپنے شریف عناصر سے بر سر پیکار ہو اور اپنے ہی سپوتوں کو نکیل ڈالنے کے لئے کوشاں ہو۔ یہاں میری مراد اسلامی عناصر سے ہے۔ یہ عزم و ارادے کے پکے اور پاکیزہ اخلاق کے حامل ہیں۔ یہ قومی اور اجتہادی مقاصد کے لئے دوسرے گروہوں کے مقابلے میں سب سے بڑھ کر مالی و جانی قربانیاں دینے والے لوگ ہیں۔ بحیثیت امت اس صالح عنصر کو پذیرائی ملنی چاہئے۔[53] حقیقتاً علمائے کرام و محدثین کرام ہی عوام الناس کا وہ طبقہ ہے جو نہ صرف انبیاء کا وارث ہے بلکہ لوگوں کی راہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیتے ہیں اسی لئے کہ لوگ علماء کی تقلید کرتے ہیں تو لازمی طور پر علمائے کرام کا کردار بھی مثالی ہونا چاہئے تاکہ کوئی ان کی طرف انگلی بھی نہ اٹھا سکے ورنہ قول و فعل کا تضاد ہی عوام کو علماء سے دور کرنے کے لئے کافی ہو گا۔ علماء کسی نسل گروہ یا خاندان یا طبقہ کا نام نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو کتاب ہدایت قرآن مجید اور احادیث رسولؐ کا علم حاصل کرے۔ فرد کے اور معاشرے کے مقصود و مال سے واقف ہو زندگی کی غایت اور ہدف سے واقف ہو، تقویٰ اور طہارت کے مطابق

زندگی بسر کرتا ہو، وہ عالم دین ہے، وہ معاشرہ میں قیادت وسیادت کا استحقاق رکھتا ہے خواہ اس کی پیدائش کسی کافر کے گھر میں ہوئی ہو۔ اس بلند تر اور برتر منصب اور ذمہ داری کے پیش نظر علماء کی تعلیم وتربیت کا نظام قدرے مختلف ہونا ضروری ہے۔ ان کو دین کا گہرا علم حاصل ہونا چاہئے اور ان کو دین کی بصیرت حاصل ہونی چاہئے۔ ان کا عمل اور کردار دینی اقدار کے مطابق ہونا چاہئے۔[54] پس موجودہ دور میں جب کہ دینی علمائے کرام اور دینی مدارس کے خلاف شورش بلند ہو رہی ہے ایسے حالات میں مسلمانوں کے تمام مسالک کے علمائے کرام کو ذاتی و مسلکی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بحیثیت مسلمان آپس میں بھی رابطہ رکھنا ہو گا اور دین اسلام کے مراکز کی طرف کئے جانے والے پراپیگنڈہ کا بھی بہتر انداز سے جواب دینا ہو گا اور اس کے لئے نہایت تحمل مزاجی اور علمی سطح پر کام کرنا ہو گا اور اسلام مخالف قوتوں کو علمی انداز سے جواب دینا ہی ہر مسلک کے مدارس کی بقا شمار ہو گا۔

## قومی یکجہتی وملکی سالمیت کے لئے لائحہ عمل:

مستقبل میں اپنی اسلامی شناخت کو اجاگر کرنے کیلئے مسلمانوں کو نفاق کی بجائے اتفاق سے کام لینا ہو گا۔ ذاتی مفادات کی بجائے اجتماعی طور پر امت مسلمہ کے مفادات کو مد نظر رکھنا ہو گا اس سلسلہ میں مسلمانوں کے اپنے تھنک ٹینک مل بیٹھ کر سائنسی اور معاشری تعاون کے بڑے بڑے ادارے تشکیل دے سکتے ہیں تا کہ مسلمان ممالک غیر مسلم ممالک کی بجائے آپس میں تعاون کو فروغ دے کر سائنسی و معاشی سرگرمیوں کو پروان چڑھا سکیں۔ مسلمانوں کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ دوسری غیر اسلامی ازموں، عقیدوں سے جان چھڑائیں، یہ ان کا فرض ہے کہ وہ صرف اسلام پر قائم رہیں۔ کیمونزم، سرمایہ داری وغیرہ کے بلاکوں سے علیحدہ رہیں، ایک اسلامی بلاک قائم رکھیں۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کے ممالک کو اس چیز نے بڑا نقصان دیا کہ کوئی روسی بلاک میں ہے کوئی کسی اور بلاک میں انہی بلاکوں کے مفادات کی خاطر انہوں نے دوسرے مسلمان ممالک کو نقصان پہنچایا، خود مسلمان کے گلے کاٹے۔[55] ڈاکٹر مبارک علی بھی اپنی تصنیف "علماء اور سیاست" میں اختلافات کو مٹانے اور مسلمان ملکوں کا معاشری و سائنسی سرگرمیوں کو فروغ دینے اور دفاع کے لئے متحدہ بلاک کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی بھی مسلمان ملک میں معاشرہ جب کبھی کسی بحران سے دوچار ہوتا ہے یا اندرونی وبیرونی خطرات سے بھر جاتا ہے تو اس وقت اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ تمام مسلمان ممالک متحد ہو جائیں اور مسلمان اقوام تمام اختلافات کو مٹا کر ایک امہ بن جائیں۔ اس سلسلہ میں ہمیشہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ماضی میں مسلمان ایک قوم تھی اور جب تک متحد رہے دنیا پر حکومت کی، مگر جیسے ہی ان میں اختلافات ابھرے، امہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، اسی کے ساتھ اس کا زوال بھی ہو گیا۔ اس لئے اگر ماضی کی طرح آج بھی یہ سب مل جائیں اور نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاک کاشغر ایک ہو جائیں تو دنیا میں انقلاب لایا جا سکتا ہے۔[56] بلاشبہ مسلمانوں کے لئے مستقبل بھی اہم ہے اور ماضی بھی ناقابل فراموش، تو ایسی صورت میں مسلمانوں کو مستقبل کے تقاضے پورا کرنے کے لئے اور مستقبل میں دوسروں کے راہبر بننے کے لئے جدید دور سے آراستہ کرنے کے لئے جدید تعلیم سے مزین معاشرہ تیار کرنا ہو گا جو کہ جدید تعلیم سے لیس بھی ہوں اور اسلامی شعار پر عمل پیرا ہونے میں سخت ہوں اور اجتہادی

انداز سے بھی آگاہ ہوں۔ پاکستان کی موجودہ صورت حال میں ہمارے لئے یہ سوال بہت اہم ہے کہ ہم قدامت پرستی کو برقرار رکھتے ہوئے اتھارٹی اور فرسودہ روایات کے تسلسل کو جاری رکھیں یا تبدیل ہوتی دنیا کے ساتھ خود کو اور اپنی سوسائٹی کو بھی تبدیل کریں کیوں کہ قدامت پرستی کا تعلق ماضی سے ہے، جب کہ تبدیلی کا تعلق مستقبل سے ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں ماضی چاہئے یا مستقبل؟[57] بلاشبہ موجودہ دور میں دنیا کے جدت خیالی کے نظریات کی روشنی میں دینی مدارس کے طلباء اور دینی مدارس کو بنیاد پرست اور پسماندہ خیال کیا جاتا ہے حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ جدید دور میں دین اسلام کو امت کو ثابت قدم رکھنے میں دینی مدارس کا ہی کردار قابل تحسین ہے۔ آج ملت اسلامیہ کا کارواں جن تند و تیز طوفان سے گزر رہا ہے اس کا انداز ہر ذی شعور راہی کو ضرور ہے۔ ایک طرف نام نہاد روشن خیالی کا دیمک جو اقدار کو چاٹنے کی درپہ ہیں اور دوسری طرف افغانستان سے لے کر لبنان تک، گروزنی سے لے کر غزہ تک اور کشمیر سے لے کر فلوجہ رماوی تک مسلم امہ کا خون بہہ رہا ہے۔ ایسے میں مدارس دینیہ وہ مورچہ ہیں جن سے مسلم امہ کے وجود اور شعور کے ساتھ ساتھ فروغ علم اور عشق رسولؐ کی حفاظت کا مورچہ بن سکتے ہیں۔[58] پس جدید دور کے مسائل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے اور اپنی طاقت کو یکجا کرنے کے لئے بحث برائے بحث اور تنقید برائے تنقید سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی اور حکومتی سطح پر بھی غیر ملکی ثقافتی یلغار کو روکنے کے لئے اقدام کرنا ہوں گے اور غیر ملکی اسلامی کلچر کی حوصلہ شکنی کے لئے اساتذہ کو خود ہی اسلامی شعائر کا پابند بنانا ہوگا اور اپنی تدریس میں بھی طلباء کی راہنمائی کرنا ہوگی تاکہ اسلامی شعائر پر عمل کرنے میں وہ فخر محسوس کریں۔ اس وقت مسلمان جن خطرات میں گھرے، جن مسائل میں الجھے، جن چیلنجوں سے نبرد آزما اور تاریخ کے جس نازک ترین موڑ سے گذر رہے ہیں وہ ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اپنی طاقت و توانائی ان فروعی مسائل میں صرف کریں جو بحث و تحقیق کے مراحل سے گزر چکے ہیں اور صدیوں سے ان پر عمل ہوتا چلا آرہا ہے یا کسی فقہی مسلک کی کسی ایسے مسئلہ کی وجہ سے مخالفت کریں جو کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے امت کی کوئی خدمت نہیں ہوتی، اسلئے ضروری ہے کہ اپنی توانائی صرف تعمیری کاموں میں صرف کی جائے اور اپنی کوششوں کو بطور اخلاقی بگاڑ، مشرکانہ عقائد، جاہلی رسوم و رواج اور غیر اسلامی بود و باش کی اصلاح کو بنایا جائے۔[59] بلاشبہ عدم برداشت کا رجحان نہ صرف انفرادی زندگی میں مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے بلکہ اجتماعی معاشرتی زندگی میں اس کے منفی اثرات کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں لیکن عدم برداشت کی وجوہات میں بے چینی، ناامیدی، گھریلو غیر مناسب حالات اور تعلقات بھی شامل ہیں۔ لہذا صبر و تحمل، رواداری، گھریلو افراد کے مناسب رویوں سے برداشت کا رجحان پیدا کیا جاسکتا ہے جو اجتماعی زندگی کے لئے بھی مفید ثابت ہوگا۔

**نتیجہ بحث:**

دینی مدارس کے عصر حاضر میں قومی یکجہتی میں کردار سے اور اہمیت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا تاہم مذہبی روحانی ضرویات پورانہ کرنے پر سماجی سطح پر کمی محسوس کی جارہی ہے۔ تاہم فروغ تعلیم میں ان کا کردار مثالی ہے۔ البتہ عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ان کے نصاب میں تبدیلی ضروری اور ناگزیر ہے تاکہ فارغ التحصیل طلباء وطالبات معاشرہ کے مفید رکن بن سکیں۔

جدید دور میں معاشرتی بہتری اور معاشرتی مسائل کے حل کے بغیر بھی خوشگوار معاشرتی فضا پیدا کرنا مشکل ہو جائے گی۔ لہذا ملکی سطح پر نوجوانوں کے مسائل حل کرنے اور معاشی زندگیاں بہتر بنانے سے ترقی پذیر ممالک کے افراد کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں کو ایک خوش کن اور رواداری والے معاشرہ میں بدلا جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے گھریلو سطح پر اور حکومتی سطح پر معاشرتی مسائل حل کرنے کی پالیسیاں ناگزیر ہیں۔ تاکہ لوگوں کی پریشانیوں کو حل کیا جاسکے کیوں کہ پریشان، مایوس اور معاشی طور پر پسماندہ افراد کے لئے صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اسی وجہ سے غریب ملک میں معاشی و معاشرتی مسائل ملکی سالمیت اور استحکام کو کمزور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ لہٰذا ان مسائل کا حل ملکی سالمیت اور بقا کیلئے ناگزیر ہے۔

**تجاویز وسفارشات:**

مذکورہ بالا بحث کو سمیٹتے ہوئے مقالہ کی روشنی میں درج ذیل تجاویز دیتے ہوئے سفارشات پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

پاکستان کا قیام خالصتا نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا اور اس کا آئین جو 1973ء میں تدوین ہوا اس میں قرار داد مقاصد کی شمولیت سے یہ آئین اسلامی قرار پایا اسی اعتبار سے اس کا نام "اسلامی جمہوریہ پاکستان" آئین میں رقم ہے۔

چناچہ اس کے نظام تعلیم کو اسلامی نظام تعلیم میں ڈھالنے کی آئینی ذمہ داری ریاست نے قبول کی ہے۔ لہذا عصر حاضر میں نظام تعلیم کو نہ تو اسلامی نظام تعلیم کہا جاسکتا ہے نہ ہی مکمل سیکولر نظام گردانہ جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ طبقاتی نظام تعلیم ہے جو قوم کی بجائے ہجوم پیدا کر رہا ہے تو زیادہ قریب قیاس ہے۔

1) دینی مدارس میں جدید علوم کے فروغ اور حصول کے لیے حکومت نیک نیتی سے سرپرستی کا فریضہ انجام دے۔

2) مساجد و مدارس کی رجسٹریشن مسلک کی بنیاد پر نہ کی جائے۔

3) علماء کرام کا یہ فرض ہے کہ وہ معاشرے میں سماجی، معاشی، معاشرتی مسائل کے حل کے لیے عوام کی رہنمائی کریں اور اس ضمن میں دینی مدارس کلیدی کردار ادا کریں۔

4) علماء کرام کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ فقہی مباحث اور مسائل کو صرف اہل علم تک محدود رکھیں۔ عوام الناس میں صرف مشترکات کو فروغ دیں تاکہ فرقہ واریت کی حوصلہ شکنی ہو سکے۔

5) دینی مدارس کے اساتذہ کرام کو سرکاری مدارس کی طرح تعلیمی اعتبار سے تنخواہیں اور گریڈ دیئے جائیں تاکہ وہ معاشی فکر سے آزاد ہو کر اپنے فرائض منصبی انجام دیں۔

6) دینی مدارس کے ذمہ داران ایک مشترکہ وفاق المدارس تعلیمی بورڈ کے طریقے امتحانات کو جدید خطوط پر استوار کریں۔

7) دینی مدارس سے وابستہ علماء کرام ایک دوسرے کے مدارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیں تاکہ سماجی سطح پر ان کے الگ الگ فقہی گروہ کا تاثر ختم ہو سکے۔

8) دینی مدارس سے وابستہ علماء کرام مساجد میں ہمہ قسم کی فروعی اور فقہی بحث سے اجتناب کریں تاکہ عوام میں منفی مذہبی جذبات پروان نہ چڑھ سکیں۔

9) علماء امت مسلمہ کی پسماندگی اور عصر حاضر کے مسائل کو جمعتہ المبارک کے خطبات میں زیر بحث لا کر قوم کو بڑے مقصد کے لیے تیار کریں۔

10) دینی اور دنیاوی نظام تعلیم کو یکساں کر کے مسٹر اور مولوی کی تفریق کو ختم کیا جائے۔

11) دینی مدارس میں ترجمہ اور تحقیق کو رواج دے کر عصر حاضر کے علوم کو قرآن و سنت کی روشنی میں عالمی برادری تک پہنچانے کا اہتمام ہو اور قرآن و سنت کو مختلف زبانوں میں پیش کرنے کے لیے مشترکہ تعلیمی و تحقیقی بورڈ تشکیل دیا جائے۔

12) موجودہ نظام تعلیم کو اسلامی نظام تعلیم میں تبدیل کرنے کی آئینی ذمہ داری کا فریضہ حکومت انجام دے تاکہ ایک ذمہ دار قوم فروغ پا سکے۔

13) علماء کرام مسالک کی بجائے مذہب اور دینی اقدار کے فروغ میں اپنی صلاحیتیں صرف کریں تاکہ ان پر مخصوص مسلک کے مبلغ ہونے کی چھاپ نہ ہو۔

14) سرکاری جامعات بالخصوص شعبہ علوم اسلامیہ کے سکالرز، ڈاکٹرز دینی مدارس میں جدید علوم پڑھانے کا فریضہ انجام دیں اور اس خدمات کے عوض انہیں مالی مراعات دی جائیں تاکہ مدارس کے طلباء جدید علوم سے روشناس ہو سکیں۔

15) جس طرح سرکاری تعلیمی اداروں میں مختلف مسالک کے اساتذہ کرام تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دینی مدارس میں بھی مختلف مسالک کے طلباء واساتذہ بھی اس طرز تدریس کو اپنائیں تاکہ فقہی ہم آہنگی فروغ پاسکے۔

## حوالہ جات:


1 انعام الحق کوثر ڈاکٹر، قومی زبان اور یکجہتی کا مسئلہ، مرتب پروفیسر مسلم سجاد، سلیم منصور خالد (1990ء) پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ، مجلہ 9، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص77

2 دہلوی محمد سعید مرزا (2012ء) مذہب اور باطنی تعلیم، فکشن ہاؤس، لاہور، ص38

3 محمد نعیم الدین حافظ (2007ء) فروغ علم میں مدارس دینیہ کا کردار، مکتبہ المجاہد، بھیرہ شریف، ص284

4 صدیقی زبیر احمد مولانا (25 نومبر 2015ء) مدارس وجامعات کا الحاق فارم پس منظر و پیش منظر روزنامہ خبریں، ملتان، ص13

5 محمد اسمٰعیل علامہ (1998ء) رسول عربیؐ اور عصر جدید، مکتبہ القریش، لاہور، ص592

6 وجاہت مسعود، بڑھتے بڑھتے عہد کا ساگر اپنے گھر تک آپہنچا ہے، مرتبہ تنویر جہاں (فروری 2008ء) رواداری، منتخب تحریریں اور دستاویزات، ڈیموکریٹک فار ہیومن ڈویلپمنٹ، لاہور، ص105

7 الطاف جاوید مولانا (2015ء) جدید اسلامی ریاست 21ویں صدی کے تناظر میں۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص20

8 ندوی ابوالحسن علی سید مولانا (2011ء) مجالس علی میاں، مرتب مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، ص681

9 خالد منصور سلیم (2005ء) دینی مدارس میں تعلیم، کیفیت، مسائل، امکانات، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص268

10 محمد سلیم سید پروفیسر (دسمبر 1993ء) دینی مدارس کے لئے نصاب نو کی تجاویز، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ص22

11 بٹ طارق پروفیسر (مارچ 2016ء) ہماری دینی جماعتوں میں اتحاد کیوں نہیں ہوتا؟ ماہنامہ البرہان، لاہور، جلد20، شمارہ3، ص26 تا27

12 محمد امین ڈاکٹر، دینی مدارس کا نظام تربیت، چند اصلاح طلب پہلو، مرتب شبیر احمد خان میواتی (اگست 2007ء) دینی مدارس اور عصر حاضر، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ص90

13 زاہد الراشدی ابوعمار (فروری 2008ء) مذہبی جماعتیں اور انتخابی سیاست، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ، ص14

14 زاہد الراشدی ابوعمار (جولائی 2008ء) خطبات راشدی (جلد اول) مرتب، قاری جمیل الرحمن اختر، الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ، ص154

15 خان ظفر حسین (فروری 1980ء) پاکستان کا تعلیمی تناظر (حصہ سوم) مکتبہ فریدی، اردو کالج، کراچی، ص19 تا20

16 بٹ طارق پروفیسر (مارچ 2016ء) ہماری دینی جماعتوں میں اتحاد کیوں نہیں ہوتا؟ ماہنامہ البرہان، لاہور، جلد20 شمارہ3، ص26

17 خالد رحمن(2008)دینی مدارس___ تبدیلی کے رجحانات،انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز اسلام آباد،ص32
18 غازی محمود احمد ڈاکٹر، مسلکی اختلاف اور اس کی حدود، مرتب ڈاکٹر سید عزیز الرحمن (دسمبر 2009ء) مسلمانوں کا دینی و عصری نظام تعلیم الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ، ص249
19 اداریہ (ستمبر 2000ء) اسلامی نظام تعلیم کی قرار داد مقاصد، ماہنامہ افکار معلم، لاہور، جلد 13، شمارہ 9، ص 5 تا 6
20 مبارک علی ڈاکٹر (2015ء) تاریخ اور مذہبی تحریکیں، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ص15
21 رسول بخش رئیس (18 نومبر 2015ء) مسلمان نوجوانوں کی مایوسی، روزنامہ دنیا، لاہور، ص12
22 مبارک علی ڈاکٹر (2015ء) تاریخ اور مذہبی تحریکیں، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ص101
23 لدھیانوی محمد یوسف مولانا (اپریل 2003ء) معاشرتی بگاڑ کا سدباب، مکتبہ لادھیانوی، کراچی، ص197
24 محمد امین ڈاکٹر (جنوری 2016ء) مسلم عروج وزوال میں تعلیم کا کردار، ماہنامہ البرہان، لاہور، جلد 20 شمارہ 1 ص12
25 محمد زکریا مولانا (مئی 2013ء) اعتدال پسندی، المعروف الاعتدال فی مراتب الرجال، بیت العلم ٹرسٹ، کراچی، ص206
26 عقیل معین الدین ڈاکٹر (1992ء) تحریک پاکستان کا تعلیمی پس منظر، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ، پاکستان، لاہور، ص41
27 ڈیوڈ بیلٹ۔ اسلامیت: معروف مغربی مباحث میں، مرتب خالد رحمن متقین الرحمن (اپریل 2014ء) آج کا مغرب اور مسلم دنیا، مباحث اور پالیسیاں، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد، ص156
28 فاروقی راجی اسمٰعیل ڈاکٹر (اپریل 1989ء) علوم جدید کی اسلامی تشکیل، عمومی اصول اور خطوط کار، ترجمہ: پروفیسر سید محمد سلیم، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور، ص19
29 غازیؒ محمود احمد ڈاکٹر (دسمبر 2014ء) محاضرات تعلیم، زوار اکیڈمی، پبلی کیشنز، کراچی، ص73
30 نیازی خان لیاقت علی ڈاکٹر (فروری 2002ء) پاکستان کے لئے مثالی نظام تعلیم کی تشکیل، تعلیمات نبویؐ کی روشنی میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص135 تا136
31 عزیز احمد پروفیسر (جون 1997ء) برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص67
32 خالد علوی ڈاکٹر (2009ء) اسلام کا معاشرتی نظام، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ص376
33 ڈاکٹر ایم اے۔ سلامی (2008ء) دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے معصوم شکار، ترجمہ محمد یحییٰ خان، نگارشات پبلشرز، کراچی، ص362
34 انعام الرحمن میاں (نومبر 2011ء) اطراف، دینی تعبیر کے چند نئے گوشے، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ص238 تا239
35 معظم کاظمی (2006ء) سامراج اور دہشت گردی، فکشن ہاؤس، لاہور، ص39
36 فضل الرحمن ڈاکٹر (دسمبر 1965ء) اسلام، ترجمہ محمد کاظم، مشعل بکس، لاہور، ص294

37 فضل الرحمن ڈاکٹر (1998ء) اسلام اور جدیدیت، ترجمہ محمد کاظم، مکتبہ جدید، لاہور، ص222
38 مبارک علی ڈاکٹر (جون 2012ء) پاکستانی معاشرہ، تاریخ پبلیکشنز، لاہور، ص85
39 محمد امین ڈاکٹر (اکتوبر 2010ء) ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل (چند نظریاتی مباحث) ادارہ مطبوعات، لاہور، ص482 تا 483
40 گیلانی مناظر احسن سید مولانا (مارچ 1976ء) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، ادارہ اسلامیات، لاہور، ص124
41 محمود سلطان بشیر (مئی 2015ء) راہ نجات، ماہنامہ البرہان، لاہور، جلد 19، شمارہ، 5 ص30
42 سمیع الحق مولانا (اگست 1976ء) اسلام اور عصر حاضر، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور، ص374
43 سمیع الحق مولانا (اگست 1976ء) اسلام اور عصر حاضر، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور، ص516
44 غزالہ ڈاکٹر (جولائی / دسمبر 2010ء)، مسلم معاشرے میں فکری و ثقافتی تغیرات، مجلہ معارف اسلامی (جلد 9، شمارہ 2) کلیہ عربی و علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ص104
45 ندویؒ علی ابوالحسن سید مولانا (جولائی 1992ء) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال پر اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص290
46 عبدالرؤف ظفر ڈاکٹر پروفیسر (فروری 2000ء) مقالات سیرت نبویؐ (حصہ دوم)، پہلی سہ روزہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس، سیرت چیئر، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور، ص653
47 مدیر (اگست 2015ء) افغان طالبان اور داعش دہشت گردی میں امریکہ کا کردار، ماہنامہ البرہان، لاہور، جلد 19، شمارہ 8 ص41
48 سلطان بشیر محمد (مئی 2015ء) راہ نجات (مسجد کو مرکز بنا کر اخلاقی، معاشی، سماجی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے) ماہنامہ البرہان، لاہور 19، شمارہ 5، ص30
49 محمد زکریا مولانا (مئی 2013ء) اعتدال پسندی، المعروف الاعتدال فی مراتب الرجال، بیت العلم ٹرسٹ، کراچی، ص214
50 محمد رفیع الدین ڈاکٹر (طبع دوم 2010ء) قرآن اور علم جدید، تعارف، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص(ر5(
51 الطاف جاوید مولانا (2015ء) جدید اسلامی ریاست 21ویں صدی کے تناظر میں، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ص29
52 فاروقی راجی اسمٰعیل ڈاکٹر (اپریل 1989ء) علوم جدید کی اسلامی تشکیل، عمومی اصول اور خطوط کار، ترجمہ: پروفیسر سید محمد سلیم، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور، ص62 تا 63
53 القرضاوی یوسف ڈاکٹر علامہ (دسمبر 2011ء) امت مسلمہ کے لئے سلامتی کی راہ، البدر پبلی کیشنز، لاہور، ص171
54 محمد سلیم سید پروفیسر (دسمبر 1993ء) دینی مدارس کے لئے نصاب نو کی تجاویز، ادارہ تعلیمی تحقیق، لاہور، ص27

55عبدالغفور حافظ ڈاکٹر پروفیسر (اکیسویں صدی کے مسائل اور ان کا حل سیرت نبویؐ کی روشنی میں) مرتب: پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر(2009ء) مقالات سیرت نبویؐ (پہلی سہ روزہ بین الاقوامی سیرت کانفرنس منعقدہ، 11، 13 فروری2000ء) سیرت چیئر دی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، ص647

56مبارک علی ڈاکٹر (2015ء) علماء اور سیاست، تاریخ پبلیکشنز، لاہور، ص155

57مبارک علی ڈاکٹر (2012ء) تاریخ کی آگہی، تاریخ پبلیکشنز، لاہور، ص139

58محمد نعیم الدین حافظ (2007ء) فروغ علم میں مدارس دینیہ کا کردار، مکتبہ المجاہد، بھیرہ شریف، ص286

59ندویؒ ابوالحسن علی سید (اپریل1996ء) بصائر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ص55

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.